

منہاج العرفان

لفظ القرآن

(لفظ و تہران کے معانی و معارف)

پروفیسر سید طاہر القادری

مرکزی ادارہ منہاج القرآن

۳۲- ایم ماڈل ٹاؤن - لاہور

2922

333

منہاج العرفان فی لفظ القرآن



(لفظ قرآن کے معانی و معارف)

پروفیسر سید طاہر نقادری

مرکزی ادارہ منہاج القرآن

۳۶۵- ایم ماڈل ٹاؤن - لاہور

ذخیرہ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شہر قیومی نقشبندی مجدی

جو 2001ء میں میاں صاحب نے

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطا فرمایا

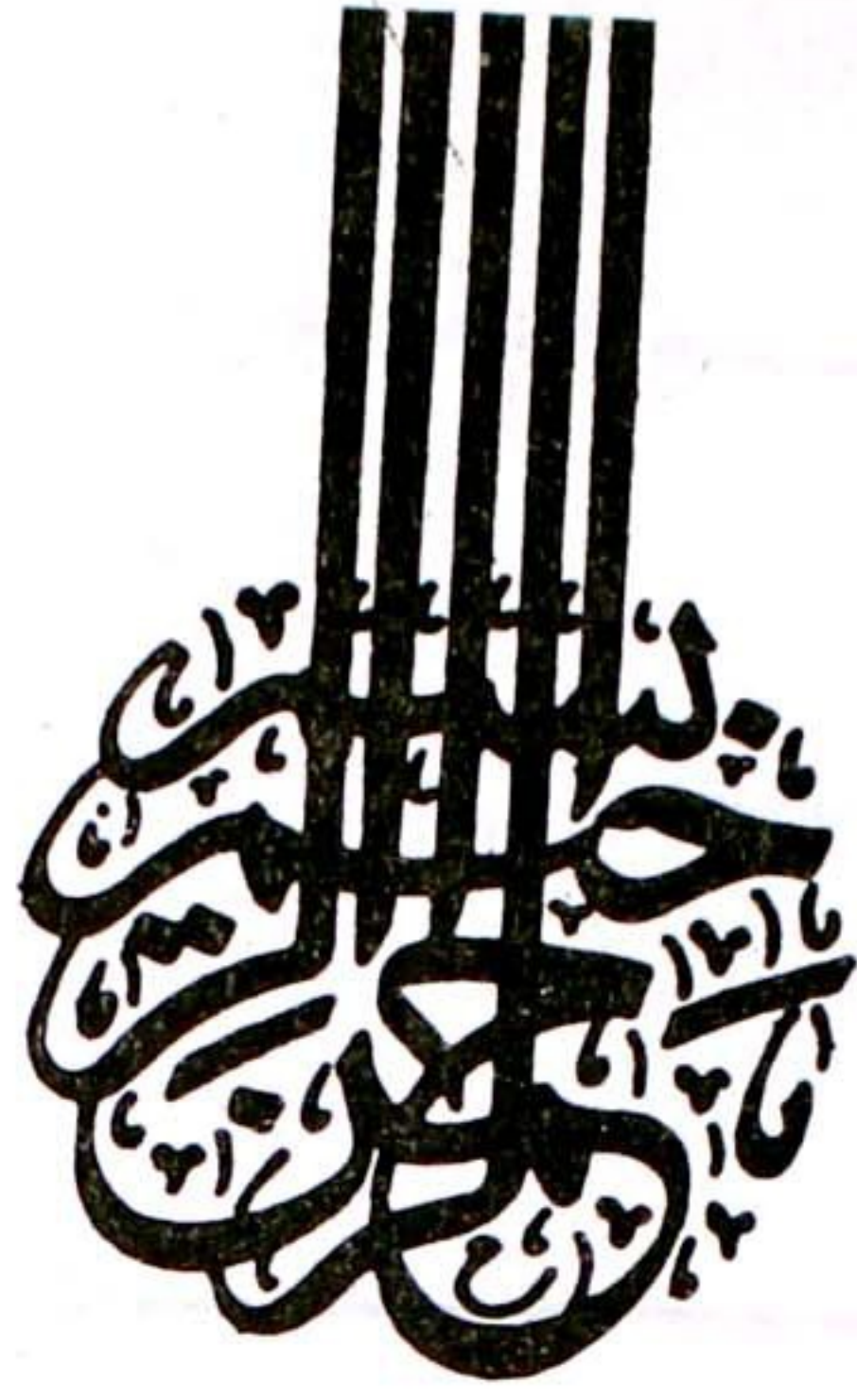
جملہ حقوق بحق 85943

~~68443~~

نام کتاب _____ مناجح العرفان فی لفظ القرآن
تصنیف _____ پروفیسر محمد طاہر القادری
اشاعت اول _____ جنوری ۱۹۸۶ء
تعداد _____ چار ہزار
مطبع _____ اُردو آرٹ پریس - لاہور
قیمت _____
Rs 1800

نوٹ

پروفیسر محمد طاہر القادری کے تمام تصانیف اور خطبات کی
ریکارڈ شدہ کمپیٹوں کے جملہ آمدنی اُن کے طرف سے
مرکزی ادارہ منہج القرآن کے لیے وقف ہے۔



مَوْلَايَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلَىٰ حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمْ

مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ

وَالْفَرِيقَيْنِ مِنْ عَرَبٍ وَمِنْ عَجَمٍ

صَلَّى اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْآلِ الطَّيِّبِينَ وَسَلَّمَ

نوٹ

کتاب ہذا مفکر اسلام، نابینہ عصر پر و فیسرح محمد طاہر القادری
کی زیر تالیف تفسیر "منہاج القرآن" کے مقدمہ کے
ایکے مجھے "لفظ تدریس" کے معانی و معارف پر مشتمل
ہے۔ تفسیر کے پہلے جلد انشاء اللہ عنقریب
منظر عام پر آجائے گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

○

قرآن اپنے نفسِ مضمون کے علاوہ عنوان کے اعتبار سے بھی تمام کتب و صحائف پر نمایاں فوقیت و امتیاز کا حامل ہے۔ علماء و مفسرین نے قرآن کے متعدد صفاتی اسماء بیان کیے ہیں۔ جن کا ذکر بنیادی طور پر خود قرآن مجید کے مختلف مقامات پر آیا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں علامہ ابوالمعالیؒ اپنی کتاب ”البرہان“ میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مختلف خوبیوں اور خصائص کے پیش نظر اس کے پچپن (۵۵) نام بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً الفرقان، الذکر، الکلام، الکتاب، النور، الہدیٰ، الشفاء، المعوذة، الحکمة، الباقی، الرحمة، احسن الحدیث، التنزیل، التذکرۃ، العروۃ الوثقی، البلاغ، الصحف القیمة، البیان وغیرہ۔ یہ سب مترادفات ہیں جو قرآن حکیم کی گوناگوں خصوصیات کے پیش نظر اس میں موقع و محل کے اعتبار سے استعمال ہوئے ہیں لیکن قرآن کا ذاتی نام جس سے اس مقدس کتاب کو تخصیص اور تشخص حاصل ہے۔ وہ ”القرآن“ ہے۔

اصطلاح قرآن کا الہامی ہونا لفظ ”قرآن“ خود قرآن مجید میں حکم و بیش ستر مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی اس کی انفرادیت اور امتیاز کا ایک پہلو ہے کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئیں وہ محرف و متبدل صورت میں جس قوم کے پاس بھی ہیں ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس وقت اپنے نام کی خود نشاندہی کرتی ہو۔ تورات جس کا موجودہ نام خمسہ موسیٰ ہے اور جو بائبل کی پہلی پانچ کتابوں پر مشتمل ہے کا مطالعہ فرمائیے یا انجیل اربعہ کا ان میں کوئی ایک تمام بھی ایسا نہیں ہے جس سے ان کے اصل ناموں کا پتہ چل سکے۔ یہی حال زبور کا ہے۔ دیگر انبیاء کی کتابیں اور صحیفے بھی اسی بائبل (کتاب مقدس) میں موجود ہیں جس کے دو حصے ہیں۔

”عہد نامہ قدیم“ اور ”عہد نامہ جدید“

اس پوری کتاب میں بھی ایسا کوئی ذکر نہیں جس سے اس کے نام کی نشاندہی ہوتی ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ عظیم امتیاز اس کلام الہی کو حاصل ہے جو تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا کہ یہ از خود اپنے نام کی ستر مرتبہ نشاندہی کرتا ہے۔

چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ (الواقعه: ۷۷)
 بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ (البروج: ۲۱)
 أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ (يوسف: ۳)
 شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ
 فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرہ: ۱۸۵)
 إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ
 أَقْوَمُ (الاسرار: ۹)

بے شک یہ بزرگی والا قرآن ہے۔
 بلکہ وہ قرآن مجید ہے۔
 ہم نے آپ کی طرف یہ قرآن نازل کیا۔
 رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن
 نازل کیا گیا۔
 بیشک یہ قرآن اس راہ کی ہدایت دیتا ہے جو
 سب سے سیدھی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کلام پاک کا نام "القرآن" کسی اور کا مجوزہ نہیں بلکہ منزل من اللہ یعنی الہامی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا نام بھی خود ہی نازل فرمایا ہے تو بہر صورت اس نام کی کوئی نہ کوئی نمایاں خصوصیت اور اہمیت ہونی چاہیے۔

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ نام کی حیثیت ایسے عنوان کی ہوتی ہے جس سے مضمون کے مشمولات (CONTENTS) کا ایک ہی نظر سے پتہ چل جاتا ہے۔ عنوان جامع و مانع ہو تو وہ مضمون کے مشمولات پر ضرور دلالت کرتا ہے۔ اس عنوان ہی کو دیکھ کر مضمون کی اصل افادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عنوان اور مضمون کا یہی تعلق اسم اور مستی کے درمیان بھی موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اسم سے مستی کے خصائص، تاثرات، کمالات اور حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب کا نام اور مضمون کلام کا عنوان خود اس لیے متعین فرمادیا کہ اس کے ذریعے انسانوں کو اس کتاب کے نفس مضمون کی عظمت و اہمیت کا خود بخود اندازہ ہو جائے۔ یہ مقصد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے تجویز کردہ نام کے ذریعے اس حسن و خوبی سے انجام نہیں پاسکتا تھا۔

لفظ قرآن کا لغوی معنی | ہر چیز کہ کسی لفظ کے محض لغوی معنی سے اس کی کامل معرفت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن کسی لفظ کی صحیح معرفت کے لیے اس کے لغوی مفہوم کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے کہ لغوی مفہوم کا تعلق اس لفظ کے مادے (ORIGIN) کے ساتھ ہوتا ہے اور اسی مادے پر مصدر اور تمام مشتقات کے معانی کا انحصار ہوتا ہے۔ جتنے بھی لفظ اس مادے سے نکلتے ہیں، ہر ایک میں اسی مادے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً معلوم، معلم، متعلم، تعلیم اور تعلم وغیرہ تمام مشتقات میں علم کا ہی مفہوم موجود ہے۔ ایسے کسی بھی لفظ کے اصل مفہوم کی صحیح معرفت کے لیے اس کے لغوی اشتقاق کا علم نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔

لفظ قرآن کے لغوی معنی کے سلسلے میں علماء کرام کے دو موقف ہیں۔ امام شافعیؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ کا موقف یہ ہے کہ لفظ قرآن "غیر مشتق" ہے۔ تورات اور انجیل کی طرح "القرآن" بھی ایسا اسم علم ہے جو کسی اور لفظ یا مادے سے ماخوذ نہیں، لیکن علماء محققین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ لفظ قرآن

مشق ہے۔ علماء لغت نے اس کے مختلف مادے بیان کیے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں :-

۱- قرأ

۲- قرآن

۳- قرآن

۴- قرآن

لفظ قرآن کا پہلا مادہ اشتقاق - قرء لفظ قرآن کا پہلا مادہ اشتقاق قرء ہے

جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے :-

قَرَأَ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ

اس لحاظ سے "قرآن" کے دو معنی قرار پاتے ہیں :-

۱- وہ کتاب جسے جمع کیا گیا۔

۲- وہ کتاب جس کے اندر سب کچھ جمع کر دیا گیا۔

پہلی معنوی دلالت | پہلے معنی کے اعتبار سے لفظ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس

کتاب کا جمع کیا جانا بھی امر الہی کے تحت اور الہامی ہدایت کے مطابق ہوگا۔ اس کی شہادت ہمیں قرآن کے حکم سے اس طرح ملتی ہے :-

إِنَّا جَمَعْنَاهُ وَقُرْآنًا
(القیامہ، ۱۷)

بے شک اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔

اس لحاظ سے لفظ قرآن "مجموع" کے معنی میں تصور ہوگا۔ جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قرآن کی جمع و تدوین اور ترتیب سب کچھ الہامی ہے۔ اس میں کسی فرد کی ذاتی رائے یا استصواب کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ اس لیے اصطلاح شرع میں "قرآن اس منزل من اللہ معین مجموعے کو کہا جاتا ہے جو کتابی صورت میں موجود ہے" مولانا عبدالحق شارح حسامی لکھتے ہیں :-

وَفِي عُرْفِ الشَّرْعِ عَلَى الْمَجْمُوعِ الْمُعَيَّنِ
الْمُنزَّلِ عَلَى الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
(نامی شرح حسامی ص ۵)

اور لفظ قرآن کا استعمال عرف شرع میں اس مجموعے معین پر ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا۔

لفظ قرآن کے پہلے معنی نے اس کتاب کی جمع و تدوین کی نسبت عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر عہد عثمانی تک کی گئی تمام کوششوں اور کاوشوں کی صحت و حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ گویا یہ ہدایات ربانی کا ایسا مجموعہ ہے جو نزول کے وقت سے لے کر قیامت تک صحیح حالت میں محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کا مجموعہ ہونا بھی الہامی حفاظت کے تحت ہے۔ اس لیے نہ کوئی اس میں رد و بدل کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

دوسری معنوی دلالت | دوسرے معنی کے اعتبار سے لفظ قرآن اس امر پر دلالت کرتا ہے

کہ اس کتاب کو "جامعیت" کا شرف حاصل ہے۔ زجاج اس قول کی تائید کرتے ہیں۔ علامہ زرکشی "البرہان فی علوم القرآن" میں اسی معنی کو نقل فرماتے ہیں۔ قرآن حکیم میں عورت کی عدت کے بارے میں حکم ہے۔ "يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ" لفظ "قُرُوءٍ" کی جمع ہے جو حیض (اور شوائف کے نزدیک طہر) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "عورتیں طلاق کی صورت میں تین حیض تک انتظار کریں۔ اس کے بعد نکاح ثانی کر سکتی ہیں۔"

بہر حال قرر کا اطلاق ایام حیض پر ہو یا طہر پر۔ یہ رحم میں خون کے جمع ہونے یا جمع شدہ خون کے جاری ہونے پر استعارہ ہے۔ چونکہ "قرر" میں بنیادی طور پر کسی شے کے جمع ہونے کا معنی موجود ہے اس لیے اس مادے کی بنا پر قرآن کے لفظ میں بھی جامعیت اور ہمہ گیریت (COLLECTION AND COMPREHENSION) کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جو اس کتاب کے جامع اور محیط ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ گویا یہ وہ کتاب ہے جو ہر شے کا علم اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے اور تمام علوم و معارف پر حاوی اور محیط ہے۔ اس معنی کی تصدیق و تائید خود قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے ہوتی ہے۔ قرآن اس لیے جامع ہے کہ اس میں جملہ حقائق کائنات اور تمام اقسام کے علوم و معارف اللہ تعالیٰ نے جمع کر دیئے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :-

تَسْمِيَةٌ هَذَا الْكِتَابِ قُرْآنًا مِنْ بَيْنِ كُتُبِ اللَّهِ لِكَوْنِهِ جَامِعًا لَشَمْرَةٍ كُتُبِهِ بَلْ لِيَجْمَعَهُ شَمْرَةٌ جَمِيعِ الْعُلُومِ (المفردات)

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں سے اس کو قرآن کہنا اس وجہ سے ہے کہ خدا کی نازل کردہ ساری کتابوں کے ثمرات و مطالب اس میں جمع ہیں۔ جبکہ یہ تمام علوم و معارف کی بھی جامع ہے۔

قرآن کی جامعیت | جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو اول سے آخر تک اصلاً تمام حقائق و معارف اور جملہ علوم و فنون کی جامع ہے۔ قرآن خود کئی مقامات پر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۸۹)

اے محبوب! ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کا تفصیلی بیان کرنے والی ہے۔

شئی کے لفظ کا اطلاق کائنات کے ہر وجود پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی۔ جو چیز بھی ذوالجلال کی تخلیق ہے "شی" کہلاتی ہے اور ہر شے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف: ۱۱۱)

قرآن ہر شے کی تفصیل بیان کرتا ہے ایک اور مقام پر ارشاد ہے :-

مَا فَزَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام، ۳۸)

اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہم نے اپنی تخلیق کردہ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کی تفصیل قرآن میں نہ ہو۔

چونکہ ازل سے اب تک جملہ حقائق اور ماکان و مایکون کے جمیع علوم قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس لیے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (الانعام، ۵۹)

اس کائنات میں کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا بیان کلام پاک میں موجود نہ ہو۔

اس آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں :-

رطب اور یابس، رطب کا معنی تر ہے اور یابس کا خشک، یہ آیت قرآنی ایجاز اور فصاحت و بلاغت کی دلیل اتم ہے۔ کیونکہ کائنات ارض و سما کا کوئی وجود اور کوئی ذرہ ایسا نہیں جو خشک یا تر یا دونوں حالتوں سے خارج ہو۔ بحر و بر، شجر و حجر، زمین و آسمان، جمادات و نباتات، جن و انس، خاکی ذرات اور آبی قطرات، حیوانات اور دیگر مخلوقات الغرض عالم پست و بالا کی جس شے کا بھی تصور کر لیجئے۔ وہ یا تو خشک ہوگی یا تر، یا دونوں حالتوں کا مرکب ہوگی، قرآن نے صرف دو لفظ لا رطب ولا یابس استعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرے کا بیان کر دیا کہ اس کا علم قرآن میں موجود ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا (بنی اسرائیل، ۱۲)

اور ہم نے قرآن میں ہر چیز کا الگ الگ مفصل بیان کیا ہے۔

علامہ ابن برہان اسی کی تائید میں فرماتے ہیں کہ :-

مَا مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ فِي الْقُرْآنِ أَوْ فِيهِ أَصْلُهُ (الاتقان، ۲: ۱۲۶)

کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر یا اس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا یا اس کی اصل ضرور موجود ہوگی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت، فہم و بصیرت اور قوت استنباط و استخراج کے پیش نظر کہی گئی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی، ہر شے کی تفصیل قرآن سے اخذ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نور بصیرت حاصل ہو، انشراح صدر ہو چکا ہو، حجابات اٹھ چکے ہوں اور رب ذوالجلال نے اس کے سینے کو قرآنی معارف کا اہل بنا دیا ہو تو اسے ہر شے کا تفصیلی بیان بھی نظر آجائے گا۔

اسی موقع پر امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اصلاً ذکر کا معنی یہ ہے :-

مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَكِّنُ أَسْتَحْرَاجُ
مِنَ الْقُرْآنِ لِمَنْ فَهَّمَهُ اللَّهُ

(الاتقان: ۲، ۱۲۶)

کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا استخراج
و استنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں۔ لیکن
یہ علوم و معارف، اسی پر آشکار ہوتے ہیں جس کو
رب ذوالجلال خصوصی فہم سے بہرہ ور فرمادیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو حضور علیہ السلام
نے ترجمان القرآن کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کے بارے میں جبریل امین نے یہ خوشخبری بھی
دی تھی :-

إِنَّكَ كَأَنَّ جِبْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ

عبداللہ بن عباسؓ اس امت کے سب سے
بڑے عالم ہیں۔

آپ فرماتے ہیں :-

لَوْ ضَاعَ لِي عَقْلُ بَعِيرٍ لَوْجَدْتُهُ
فِي كِتَابِ اللَّهِ

(الاتقان: ۲، ۱۲۶)

(صحبت نبوی کے فیضان سے مجھے قرآن کی اس قدر
معرفت حاصل ہو چکی ہے کہ میرے اونٹ
کی رسی بھی گم ہو جائے تو قرآن کے ذریعے
تلاش کر لیتا ہوں۔

اونٹ کی رسی کا گم ہونا کتنا معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اہل بصیرت ایسا معمولی سے معمولی واقعہ اور
حادثہ بھی قرآن سے معلوم کر لیتے ہیں۔ محقق ابن سراقہ "کتاب الاعجاز" میں جامعیت قرآن پر روشنی
ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مَا مِنْ شَيْءٍ فِي الْعَالَمِ إِلَّا
وَ هُوَ فِي كِتَابِ اللَّهِ

(الاتقان: ۲، ۱۲۶)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو
سکتی۔ گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا
قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی چیز کے ذکر یا عدم ذکر کو کائنات میں اس کے وجود و عدم کی
دلیل تھوڑا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ نے جامعیت قرآن کی نسبت یہ دعویٰ کیا :-

سَلَوْنِي عَمَّا شِئْتُمْ أَحْبَبْتُكُمْ

عَنْهُ فِي كِتَابِ اللَّهِ

(الاتقان: ۲، ۱۲۶)

جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو، میں
تمہیں اس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

آپ نے حضرت سعید بن جبیرؓ کا یہ قول بھی اپنی کتاب "الام" میں نقل فرمایا ہے :-
 ما بلغنی حدیث عن رسول اللہ علی وجہہ
 الا وجدت مصداقہ فی کتاب اللہ
 (ایضاً)
 مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے
 قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب اور علوم و معارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے۔ امام بیہقیؒ
 حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں جن میں کائنات کے
 تمام علوم و معارف بیان کر دیئے۔ پھر ان تمام علوم کو چار کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) میں جمع کر دیا۔
 پھر ان میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآن حکیم میں جمع فرمایا اور اس طرح یہ قرآن ایسی
 جامع کتاب قرار پائی کہ ابن ابی الفضل المرسیؒ فرماتے ہیں کہ :-

جمع القرآن علوم الاقلین والآخرین،
 بحیث لم یحط بہا علماً حقیقۃً
 الا المتکلم ثم رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم (الاتقان، ۲ : ۱۲۶)
 اس قرآن نے اول سے آخر تک ابتداء سے
 انتہا تک کائنات کے تمام علوم و معارف کو اپنے
 اندر اس طرح جمع کر لیا ہے کہ فی الحقیقت خداؤ
 اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ان علوم
 کا احاطہ نہ کوئی آج تک کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس سلسلے میں مروی ہے :-

مَنْ أَرَادَ الْعِلْمَ فَعَلَيْهِ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّ
 فِيهِ خَيْرَ الْأَوْلِيْنَ وَالْآخِرِينَ
 (ایضاً)
 جو شخص علم حاصل کرنا چاہے۔ اس کے لیے ضروری
 ہے کہ وہ قرآن کا دامن محکم لے۔ کیونکہ اسی قرآن
 میں ہی اول سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف کا جامع ہونا، تمام موجودات عالم کے احوال کا جامع ہونا اور تمام
 آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب کا جامع ہونا، یہ وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے باعث اس
 مقدس کتاب کا نام اللہ تعالیٰ نے "القرآن" رکھا ہے۔

جامعیت قرآن کی عملی شہادتیں

پہلی شہادت | حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (۶۳ برس) عمر مبارک کا قرآن سے استشہاد :

امام جلال الدین سیوطی "الاتقان" میں اس ضمن میں یہ آیت نقل کرتے ہیں۔

وَلَنْ يَتُوحَّشِرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ
 أَجَلُهَا (المنافقون : ۱۱)
 جب کسی کی اجل آجائے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ
 کی بھی تاخیر نہیں فرماتے۔

قرآن کریم کی اس آیت کا اطلاق عمومی ہر انسان کی موت تک ہے لیکن اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت اس میں وصال محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا تھا۔

یہ آیت "سورۃ المنافقون" (جو قرآن مجید کی تریسٹھویں (۶۳) سورۃ ہے) کی آخری آیت ہے۔

جس کے بعد رب ذوالجلال نے "سورۃ تغابن" کو منتخب فرمایا۔ تغابن ناپید ہو جانے اور ہست سے نیست ہو جانے کو کہتے ہیں۔ ۶۳ ویں سورت کے اختتام پر کسی پر وقت اجل کے آجانے کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی ظاہری عمر مبارک ۶۳ ویں برس پر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور اس آیت کے فوراً بعد سورۃ تغابن کا انتخاب مزید صراحت کے لیے تھا کہ اب اس ہستی مبارک کی حیات ظاہری کے ناپید ہو جانے کے بعد انھما قیامت کا ہی دور آئے گا۔ درمیان میں کسی اور نبی یا امت کا دور ممکن نہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا دور نبوت، روز قیامت سے متصل ہے درمیان سارے عرصے کو یہی محیط ہے۔ کسی اور کا زمانہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی درمیان والی انگلی اور انگشت شہادت کو ملا کر فرمایا تھا :-

میں (یعنی میرا دور) اور قیامت دونوں آپس میں

انسا والساعة کہاتین

ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔

جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح میرے دور نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ یا زمانہ نہیں۔ گویا یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کے تعیین کے ساتھ ساتھ آپ کے ختم نبوت کے اعلان پر بھی مشتمل ہے۔ اس شہادت سے "قرآن" کی شان جامعیت بے روشنی پڑتی ہے۔

دوسری شہادت | امام غزالیؒ سے ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ اجرام فلکی یعنی سورج، چاند

اور دیگر سیارگان فضا میں جو حرکت کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری معکوس! مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف۔ قرآن مجید میں ایک کا ذکر تو موجود ہے لیکن دوسری کا کہاں ہے؟ اس پر امام غزالیؒ نے اس شخص سے پوچھا کہ پہلی حرکت کا ذکر کس آیت میں ہے؟ اس نے یہ آیت پڑھی :-

سارے سیارے (فضا میں) تیرتے رہتے ہیں۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

یعنی حرکت پذیر رہتے ہیں۔

(الین ، ۱۴۰)

امام غزالیؒ نے فرمایا۔ اسی آیت میں ان کی حرکت معکوس کا ذکر بھی ہے۔ اگر "كُلٌّ فِي فَلَكٍ"

کے الفاظ کو الٹا کر کے یعنی معکوس طریقے سے پڑھا جائے یعنی فلک کی ک سے شروع کر کے کُل کی ک تک

پڑھا جائے تو پھر بھی ”کُلُّ فِي فَلَكٍ“ ہی بنے گا۔ گویا آیت کے اس حصہ کو سیدھی سمت میں پڑھنے سے سیارگانِ فلکی کی سیدھی حرکت کا ذکر ہے اور معکوس سمت میں پڑھنے سے حرکتِ معکوس کا ذکر ہے۔

ا کُلُّ فِي فَلَكٍ کو الٹی سمت سے پڑھیے، فَلَكٍ میں آخری حرف ”ک“ ہے۔ پھر ”ل“ ہے تو یہ کُلُّ بن گیا۔ اب الٹی سمت سے اگلا حرف ”ف“ ہے اور پھر ”ی“۔ اس طرح یہ فی بن گیا۔ اس کے بعد ”ف“ آتا ہے۔ پھر ”ل“ اور آخری حرف ”ک“ ہے تو یہ فَلَكِ ہو گیا۔ چنانچہ الٹی ترتیب سے بھی کُلُّ فِي فَلَكٍ ہی بنتا ہے۔ یہی سیارگان کی سیدھی حرکت ہے اور انہی لفظوں میں ان کی الٹی حرکت بھی مذکور ہے۔

تیسری شہادت — ”واقعہ تسخیر ماہتاب اور قرآن“ | اس ضمن میں ایک اور

شہادت تسخیر ماہتاب کے واقعہ سے متعلق ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل امریکہ کے تین سائنس دانوں کے ہاتھوں تسخیر ماہتاب کا عظیم تاریخی کارنامہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا:

وَالْقَمَرَ إِذَا تَسَّقَوْا لَتَرَكَبُوهُ
طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۚ فَمَا لَهُمْ
لَا يُؤْمِنُونَ (الانشقاق: ۱۸، ۱۹، ۲۰)

قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے، یقیناً تم طبق در طبق اُوپر جاؤ گے۔ پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

ان تینوں آیات کا باہمی ربط اور سیاق و سباق یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت سے پہلے رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے پہلے اجرامِ فلکی، کائناتِ نظام اور بالخصوص نظامِ شمسی کے اہم پہلوؤں کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اہم تغیرات کا بھی ذکر ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں۔ کبھی شفق کی اور کبھی رات کی۔ تیسری قسم چاند کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا کہ ”تم یقیناً ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے“ یعنی تم طبق در طبق پرواز کرو گے۔

اس آیت کی علماء نے متعدد تفسیرات بیان کی ہیں۔ اس کا معنوی اطلاق ”واقعہ معراج“ پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے طبق در طبق سے انسانی اعمال و درجات کا بلند ہونا مراد لیا ہے۔ بعض نے حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل ارتقاء اور احوال مراد لیے ہیں۔ احادیثِ نبوی سے بھی ”حال در حال“ کے معنی کا استشہاد لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی

۱۰ امام غزالی سے متعلق اصل حوالہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مجھ سے قبل والدِ محترم حضرت علامہ

فرید الدین قادری نے بیان فرمایا تھا۔

جگہ درست اور ناقابل تردید ہیں لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر پہلے کسی آیت کی ایک تفسیر بیان ہو چکی ہو تو اس کا صرف وہی ایک ہی مفہوم ہوگا۔ باقی مفہام، مطالب اور تعبیرات غلط ہوں گی۔ تفسیر قرآن کے ضمن میں ایسی بات درست نہیں۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے اہل علم متعدد تعبیرات اخذ کرتے چلے آئے ہیں اور متقدمین و متاخرین کی کتب تفسیر اس پر شاہد عادل ہیں۔ مختلف احوال پر انطباق کے اعتبار سے ہر تعبیر اپنی اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم اس مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے تفسیر آیت عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے:-

وَالْقَمَرَ إِذَا تَسَّقَ (الانشقاق، ۱۸) قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق، ۱۹) یقیناً تم ایک سے دوسرے طبق تک اوپر جاؤ گے۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (الانشقاق، ۲۰) پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔
قرآن حکیم کا انداز بیان، ربط بین الآیات اور نظم عبارت کا ایک ایک پہلو بلکہ ایک ایک حرف مستقل مفہوم، نمایاں افادیت اور خاص حکمت و مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" سے پہلے متصلاً قرآن حکیم کا چاند کی قسم کھانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے بیان ہونے والی حقیقت چاند سے ہی متعلق ہوگی۔

لَتَرْكَبُنَّ، ر کب یر کب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی پر سوار ہونا، اسی سے اسم ظرف مرکب نکلا ہے یعنی سوار ہونے یا بیٹھنے کی جگہ، گھوڑے پر سوار ہوتے وقت جس پر پاؤں رکھا جاتا ہے۔ اسے بھی اسی وجہ سے رکاب کہتے ہیں۔

گویا لَتَرْكَبُنَّ کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اوپر جانا کسی سواری کے ذریعے ہوگا۔
امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

الركوب في الاصل كون الانسان على ظهر حيوان وقد يستعمل في السفينة (المفردات)
رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پر سوار ہونے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کا استعمال جہاز پر بھی ہوتا ہے۔

لہذا اولیں ترجیح کے طور پر ہم "لَتَرْكَبُنَّ" کے اصل اور حقیقی معنی کا استعمال مراد لیں گے۔ مجازاً بلند ہونا مراد نہیں لیں گے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جب کہ حقیقت مستعمل ہو، متعذرہ یا مجبورہ نہ ہو تو مجازی معنوں کی طرف التفات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی اس قدر

فروغ پذیر نہ ہونی تھیں کہ انسان زمین سے پرواز کر کے اوپر کسی دوسرے طبقے تک پہنچ سکے۔ اس وقت تک مجازی معنوں کی بنیاد پر ہی آیت کا مفہوم بیان کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنی کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنسی ترقی کے دور میں فضائی حدود میں انسانی پرواز نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو گئی ہے تو لَتْرُكْبُنَّ کا اپنے حقیقی معنی پر اطلاق بلاشبہ جائز ہوگا۔

مزید برآں لَتْرُكْبُنَّ میں لاوِ تاکیدی اور نونِ ثقیلہ دونوں اظہارِ مقصود میں خصوصی تاکید پیدا کر رہی ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ آیت متذکرہ میں بیان ہونے والا واقعہ بہر صورت رونما ہو کر رہے گا۔ کیونکہ یہ ترکیب مستقبل میں صدورِ فعل پر دلالت کیا کرتی ہے۔ لہذا یہ آیت پیشینگوئی کے اعتبار سے ایک چیلنج کے طور پر نازل کی گئی اور لَتْرُكْبُنَّ کے اعلان سے قبل پے درپے قسموں کا ذکر منکرینِ قرآن کے لیے اس چیلنج میں مزید شدت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے تھا۔ مستزاد یہ کہ لَتْرُكْبُنَّ جمع کا صیغہ ہے اور صیغہ جمع عام طور پر عربی زبان میں کم از کم تین کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ لَتْرُكْبُنَّ کے فاعل کم از کم تین افراد ہوں گے۔ جو ایک طبقے سے دوسرے تک پرواز کر کے جائیں گے۔ اب پھر آیات اور ان کی ترکیب ملاحظہ کیجئے۔

قرآن قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ اے بنی آدم تم میں سے کم از کم تین افراد پرواز کریں گے۔ کہاں سے کہاں تک؟ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" ایک طبقے سے دوسرے طبقے تک۔ پہلا طبقہ تو یقیناً زمین ہے کیونکہ مخاطب اہل زمین تھے اور کسی دوسرے طبقے تک جائیں گے۔ دوسرے طبقے کا تعین بھی حکیمانہ انداز میں کیا گیا۔ اگر یہاں دوسرے طبقے کے لفظ کی بجائے سیدھا چاند ہی کہہ دیا جاتا تو پھر تسخیرِ کائنات کی مہم صرف طبقہ مہتاب تک محدود ہو کر رہ جاتی اور ربِ ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ انسان کی پرواز زمین کے بعد چاند پر جا کر رک جائے بلکہ وہ چاند کے بعد دیگر اجرامِ فلکی کی تسخیر بھی چاہتا تھا۔ اس لیے لفظ طبقے کو تنوین کے ساتھ عام کر دیا تاکہ یکے بعد دیگرے انسان اجرام و طبقاتِ کائنات کو تسخیر کرتا چلا جائے اور رازِ کائنات فاش کرنے کی مہم جاری رہ سکے۔ لیکن پہلا طبقہ جس پر اولاً انسان پہنچے گا وہ چاند ہوگا۔ اس لیے اس کی قسم پہلے کھانی گئی۔ کیونکہ زمین کے سب سے زیادہ قریب چاند ہی کا طبقہ تھا۔ باقی سب اس کے مقابلے میں دُور تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اہل زمین کو یہ پیشینگوئی سانی گئی کہ تم میں سے کم از کم تین شخص کسی چیز پر سوار ہو کر پرواز کریں گے اور زمین کے طبقے سے چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن تسخیرِ مہتاب کے بعد انسان کی تک دو ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جاری رہے گی۔ اب اسی طرح مریخ کے طبقے تک بھی انسان رسائی حاصل کرتا

دکھائی دے رہا ہے۔ انسانی پرواز کی یہ کامیاب کاوشیں دراصل واقعہ معراج کی صحت و حقیقت پر

روشن مادی دلیلیں بنتی جا رہی ہیں۔ بقول اقبالؒ

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ معجزات و کرامات جن کے امکان و وقوع کو انسانی عقل منطقی پیمانوں پر سمجھنے سے قاصر تھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے کسی حد تک ان کے سمجھنے کی مادی اور عقل بنیادیں فراہم کر دی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر منکشف ہوتا جا رہا ہے کہ انسان جسے ایک دور میں ناممکن سمجھتا ہے وہ مستقبل میں نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے نام نہاد عقل پسند طبقے کے انکارِ خوارق کی یہ دلیل کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور سمجھ میں نہیں آتی قابل التفات نہیں رہتی۔ کیونکہ عقل کا انحصار صرف محسوسات و مشاہدات پر ہوتا ہے اور جب تک کوئی حقیقت محسوس نہ ہو یا اس کی کوئی مثل مشاہدے میں نہ آئی ہو۔ عقل اس کے امکان کو کیونکر سمجھ سکتی ہے۔ اس لیے عقل کا فیصلہ جزئی و اضافی ہوتا ہے۔ وہ کلی و مطلق نہیں ہو سکتا۔ جب کہ قرآن کا ہر دعویٰ ابدی ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ انسانی عقل قرآن کے بعض دیگر دعاوی و اعلانات کو آج ممکن نہ سمجھے لیکن مستقبل کے کسی دور میں وہ سب کچھ ممکن اور واقع نظر آنے لگے۔ لہذا محض عقل کے قصورِ فہم کی بنا پر کسی حقیقت کا انکار کر دینا نادانی ہے۔ عافیت ایمان بالغیب میں ہی ہے۔

مزید برآں تسخیرِ ماہتاب کی متذکرہ بالا قرآنی تعبیر کی نسبت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس موقع پر تین امریکی سائنسدانوں میں سے صرف دو چاند کی سطح پر اترے تھے اور تیسرا شخص چاند گاڑی کے اس حصے پر رہا تھا۔ جو چاند کے گرد گھومتا رہا تا کہ بعد ازاں گاڑی کے چاند پر اترنے والے حصے کو ساتھ ملا کر واپس لاسکے۔ لہذا الترتیب کا اطلاق تین افراد پر کیسے ہو گیا۔ یہ اعتراض دراصل غور و فکر نہ کرنے کے باعث پیدا ہوگا۔ بات چاند کی سطح پر اترنے کی نہیں بلکہ چاند کے طبق تک پہنچنے کی ہو رہی ہے اور یہی لہذا "طبقات عن طبق" کے الفاظ سے مستفاد ہے۔ اس امر کا اعتراف تو صاحب اعتراض کو بھی ہو گا کہ اس طبق تک تو تین ہی افراد پہنچے۔ ایک گاڑی پر چاند کے گرد گھومتا رہا اور دوسرے کی سطح پر اتر گئے۔

طبق محض کسی سیارے کی سطح (SOIL SURFACE) کو نہیں کہتے بلکہ کسی سیارے اور اس کے گرد فضائی حدود پر مشتمل اس وسیع و عریض حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک اس سیارے کی کشش ثقل (FORCE OF GRAVITATION) اثر انداز ہوتی ہے اور یہ علاقہ یا طبق سیارے کی سطح کے گرد فضا میں ہزاروں میل تک محیط ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز کی پرواز زمین کی سطح پر نہیں بلکہ اس سے اوپر فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے۔ لیکن طبقِ ارضی میں ہی تصور کی جاتی ہے۔

چنانچہ قرآن بھی طبق ارضی سے پرواز کر کے انسان کے دیگر طبقاتِ فلکی تک پہنچنے کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ انسان کی ایسی کامیابیوں کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کائنات کے اندر یعنی آسمانوں اور زمین کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے وہ انسان کے لیے تخلیق کیا گیا اور انسان ہی کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الباقیہ، ۱۳) لیے مسخر کیا گیا ہے۔
اس کے بعد سورۃ الشقاق کی زیر مطالعہ آیت سے آگے فرمایا گیا :-

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشاق، ۲۰) پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔
اے فرزندِ آدم! تم میں سے کچھ افراد زمین سے اٹھ کر چاند کے طبق تک پہنچیں گے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اس دعوے کے پورا ہو جانے اور اس طبق پر بھی ہماری قدرت کا نظام دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔ ایمان نہ لانے کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تسخیرِ ماہتاب کی مہم غیر مسلموں کے ہاتھ سے سر ہوگی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تین غیر مسلم سائنسدان چاند تک پہنچے، وہاں بھی تخلیقِ خداوندی کے مناظر دیکھے۔ اس کے نظامِ قدرت کا مشاہدہ کیا۔ لیکن قرآنی دعوے کے مطابق ان کی قوم قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائی۔

تسخیرِ کائنات کے مذکورہ بالا قرآنی بیان کی تصدیق ایک غیر مسلم فرانسیسی سکالر MAURICE BUCAILLE نے اپنی کتاب "THE BIBLE THE QURAN AND SCIENCE" کے صفحات نمبر ۱۶۷ تا

"THE CONQUEST OF SPACE" کے باب میں "THE QURAN AND MODERN SCIENCE" پر ۱۶۹

کے زیر عنوان ان الفاظ سے فراہم کی ہے۔

"THE CONQUEST OF SPACE"

From this point of view, three verses of the Qur'an should command our full attention. One expresses, without any trace of ambiguity, what man should and will achieve in this field. In the other two, God refers for the sake of the unbelievers in Makka to the surprise they would have if they were able to raise themselves up to the Heavens; He alludes to a hypothesis which will not be realized for the latter.

There can be no doubt that this verse indicates the possibility men will one day achieve what we today call (perhaps rather improperly) 'the conquest of space'. One must note that the text of the Qur'an predicts not only penetration through the regions of the heavens, but also the Earth, i.e. the exploration of its depths.

1) The first of these verses is sura 55, verse 33: "O assembly of Jinns and Men, if you can penetrate regions of the heavens and the earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a Power."

2) The other two verses are taken from sura 15, (verses 14 and 15). God is speaking of the unbelievers in Makka, as the context of this passage in the sura shows:

"Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending therein, they would say: our sight is confused as in drunkenness. Nay, we are people bewitched."

The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

When talking of the conquest of space therefore, we have two passages in the text of the Qur'an: one of them refers to what

will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man, and the other describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a condition never to be realized. The event will however be seen by others, as intimated in the first verse quoted above. It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travellers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitched . . .

This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventure since the first human spaceflight around the world in 1961.

It is a completely new spectacle therefore that presents itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present-day man.

چنانچہ یہ دعوائے بجا طور پر سچ ہے کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے۔

چوتھی شہادت | جامعیت قرآن کی نہایت وسیع اور عملی شہادت یہ بھی ہے کہ قرآن

اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کی نجی زندگی کی فکری و عملی ضروریات سے لے کر عالمی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے۔ حیاتِ انسانی کا مذہبی و روحانی پہلو ہو یا مادی و جسمانی، عالمی و خاندانی پہلو ہو یا سماجی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پہلو ہو یا تعلیمی و ثقافتی، حکومت و سلطنت کی تاسیس ہو یا ادارت کی تشکیل، مختلف طبقاتِ انسانی کے نزاعات و معاہدات ہوں یا اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات، الغرض قرآنی احکام و تعلیمات اس قدر جامع ہیں کہ ہر مسئلے میں اصولی رہنمائی قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے علماء نے آیاتِ قرآنی کی تقسیم بھی کی ہے۔ معروف قول کے مطابق قرآن حکیم کی کل آیات (۶۶۶۶) کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ آیاتِ امر (۱۰۰۰) آیاتِ نہی (۱۰۰۰) آیاتِ وعدہ (۱۰۰۰) آیاتِ وعید (۱۰۰۰) آیاتِ مثال (۱۰۰۰) آیاتِ قصص (۱۰۰۰) آیاتِ تحلیل (۲۵۰) آیاتِ تحریم (۲۵۰) آیاتِ تسبیح (۱۰۰) آیاتِ متفرقہ (۶۶)

قرآنی احکام کا بیان و استنباط کہیں "عبارۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اشارۃ النص" سے کہیں

"دلالت النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اقتضار النص" سے کہیں اس کا انداز حقیقت ہے کہیں مجاز

کہیں صریح ہے کہیں کنایہ، کہیں ظاہر ہے کہیں خفی، کہیں مجمل ہے کہیں مفسر کہیں مطلق ہے کہیں

مقیّد، کہیں عام ہے کہیں خاص۔ الغرض قرآنی تعلیمات مختلف صورتوں اور طریقوں میں موجود ہیں۔ ان میں اصل احکام (SUBSTANTIVE LAWS) بھی ہیں اور ضابطہ جاتی (PROCEDURAL LAWS) بھی۔ جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے :-

لِكُلِّ جَمَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ
 مِنْهَا جَا (المائدہ، ۴۸) قانون بنایا اور ایک اس کا ضابطہ و طریق کار
 چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق قوانین اور اصول و ضوابط کا استخراج اصلاً قرآن ہی سے کیا ہے۔

اسی طرح قرآن علوم کے بیان کے اعتبار سے بھی جامع و مانع ہے۔ دنیا کا کوئی مفید علم ایسا نہیں جس کا سرچشمہ قرآن نہ ہو، قاضی ابوبکر بن عربیؒ اپنی کتاب "قانون التاویل" میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد ستر ہزار چار سو پچاس (۷۷۲۵۰) بیان کرتے ہیں۔ یہی تعداد قرآن مجید کے کلمات کی بھی ہے تو اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ قرآن حکیم میں الحمد سے والناس تک استعمال ہونے والا ہر کلمہ یقیناً کسی نہ کسی مستقل علم اور فن کی بنیاد ہے۔ گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے۔ یہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر و باطن کے لیے ایک حد آغاز ہے اور ایک حد اختتام۔ اس لحاظ سے ہر قرآنی حرف کے چار پہلو متعین ہوتے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن عربیؒ متذکرۃ الصدر تعداد کو پھر چار سے ضرب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ درحقیقت قرآنی علوم کی تعداد کم از کم تین لاکھ نو ہزار آٹھ سو (۸۰۰، ۰۰۹، ۳) ہے۔ یہ تو ایک بزرگ کی وسعت نظر ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ امام رازیؒ سے پوچھیں تو وہ فرماتے ہیں کہ صرف تعویذ و تسمیہ (اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم اور بسم اللہ الرحمن الرحیم) میں لاکھوں مسائل کا بیان ہے اور باقی آیات و کلمات کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علوم کے اعتبار سے بھی قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی صحیح تعداد کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ۔ ایسے اقوال یا تو ان کا برکی تحقیقات ہیں یا ان کے ذاتی انکشافات، درحقیقت قرآنی علوم احصار و تحدید سے ماوراء ہیں۔ کوئی علم ہو یا فن، کوئی صنعت و حرفت ہو یا پیشہ تجارت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی دریافت ہو یا علوم قدیمہ کی، اس کائنات میں کوئی ایسی شے معرض وجود میں نہیں آئی اور نہ آ سکتی ہے جس کا ذکر خلاق عالم نے کسی نہ کسی انداز سے قرآن مجید میں نہ کر دیا ہو۔

فلسفہ (PHILOSOPHY) تمام علوم کا سرچشمہ اور مبداء تصور کیا جاتا ہے۔ علم طبیعیات (PHYSICS) اور علم حیاتیات (BIOLOGY) بھی ابتداءً فلسفے ہی کا حصہ تھے۔ طبیعی کائنات کے حقائق سے بحث کرنے

والے علوم یہی تین ہیں -

فلسفہ شروع سے آج تک تین چیزوں سے بحث کرتا چلا آیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے؟ اعلیٰ ترین نصب العین کیا ہے؟ گویا فلسفے کی بحث حقیقت، علم اور نصب العین سے ہے۔ اسی طرح طبیعیات کا موضوع تحقیق یہ ہے کہ موجودات عالم اور مظاہر طبیعی کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور ان مظاہر طبیعی کی حرکت کی علت کیا ہے؟ حیاتیات کا موضوع یہ ہے کہ انسان اور دیگر مظاہر حیات کی اصل کیا ہے؟ اور تمام مظاہر حیات کی حرکت اور زندگی کی علت کیا ہے؟ تینوں علوم کا خلاصہ مبحث یہ ہوا کہ :-

فلسفہ کائنات کی حقیقت، اعلیٰ نصب العین اور اس کے علم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ طبیعیات مظاہر طبیعی اور ان کی حرکت کو جاننے میں مصروف ہے۔ جب کہ حیاتیات مظاہر حیات کے آغاز اور اور ان کے ارتقار کو سمجھنے میں مشغول ہے۔ آج تک یہ علوم اقدام وخطا TRIAL AND ERROR کے انداز میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک علم و فن نے بھی یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مظاہر حیات کے نقطہ آغاز کو یقینی طور پر جان لیا یا اس نے ان کی حرکت کی علت کو حتمی طور پر متعین کر لیا ہے اسی طرح فلسفہ آج تک یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ یہ حقیقت، کائنات کی حتمی وابدی حقیقت ہے۔ ہندوستان کے لو کے نو فلسفے نفسِ ناطقہ کو بھی حقیقت مانتے ہیں اور مادہ کو بھی۔

فلسفہ اور قرآن | ہزاروں سال کی انسانی جدوجہد کے باوجود آج تک یہ علوم و فنون اپنی صحت اور بحال کی حتمی منزل کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن آفری المامی کتاب قرآن کا یہ عالم ہے کہ سورہ علق کی صرف پہلی ہی پانچ آیتوں نے فلسفے کے تمام مسائل کو حل کر دیا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں :-

پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا فرمایا۔ انسان کو خون کے پھٹکے (یا داعیہٴ محبت) سے تخلیق کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے زیادہ بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا (جس نے) انسان کو وہ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

۱- اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ
۲- خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ
۳- اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ
۴- الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ
۵- عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ
(العلق، ۱-۵)

اگر غور کریں تو ان آیات میں فلسفہ کے جملہ موضوعات اور ان کے حتمی جوابات بیان کر دیئے گئے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

ان آیات کی تفسیر اور وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لیے آج تک تاریخ انسانی میں جتنی فلسفیانہ کوششیں

ہوتی ہیں۔ وہ سب قطعیت و حتمیت سے محروم ہیں۔ لیکن قرآن کی جامعیت و قطعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانچ مختصر فقرات میں فلسفے کے تمام موضوعات، مسائل تحقیق اور ان کے حتمی جوابات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اب یہ اہل تحقیق کا کام ہے کہ وہ اس رُخ پر ریسرچ کریں اور ان حقائق کائنات کی کامل معرفت حاصل کریں۔

سائنس اور قرآن | اسی طرح طبیعی اور حیاتیاتی سائنس جن مسائل پر تحقیق سے عبارت ہے۔

وہ اصطلاحات کی صورت میں درج ذیل ہیں :-

① تخلیق کائنات اور اس کا تشکیلی نظام (CREATION OF UNIVERSE AND ITS STRUCTURAL SYSTEM)

② زمانہ ہائے تخلیق اور ادوار ارتقاء۔ (PERIODS OF CREATION AND ERAS OF EUOLUTION)

③ وجود کائنات کی طبیعی اور کیمیائی اساس (PHYSICAL AND CHEMICAL BASIS OF THE FORMATION OF UNIVERSE)

④ زمین اور ظہور زندگی (EARTH AND APPEARANCE OF LIFE)

⑤ ارتقاء حیات کے طبیعی اور کیمیائی مراحل (PHYSICAL AND CHEMICAL PROCESS OF EVOLUTION OF LIFE)

⑥ اجرام فلکی کی ماہیت اور نظام کار (NATURE AND PHENOMENA OF HEAVENLY BODIES)

⑦ انسانی زندگی کا آغاز اور نظام ارتقاء۔ (ORIGIN OF HUMAN LIFE AND ITS DEVELOPMENT)

⑧ نباتات و حیوانات کی زندگی (THE VEGETABLE AND ANIMAL KINGDOMS)

⑨ افزائش نسل انسانی کا نظام (SYSTEM OF HUMAN PRODUCTION AND SELF PERPETUATION)

ان تمام سائنسی موضوعات پر قرآن حکیم نے بہت سا بنیادی مواد فراہم کیا ہے جو اس میں سیکٹروں مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ ہم استشہاد کے طور پر یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں :-

۱۔ اَوَلَعَرِبَرَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اِنَّ السَّمٰوٰتِ كَانَتْ

وَالْاَرْضُ كَانَتْ اَرْضًا فَتَقَنَّهَا ط کے بالائی اور زیریں حصے، دونوں باہم پیوست

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ

تھے یعنی ایک تخلیقی وحدت (UNIT OF CREATION) کی صورت میں موجود تھے۔ ہم نے

ان دونوں کو جدا جدا کر کے کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے تخلیق کیا۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ہم نے زمین کی تیز رفتاری کے باعث اس میں پیدا ہونے والی جنبش کو ختم کرنے

کے لیے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے تاکہ وہ اپنے اوپر بسنے والی مخلوق کو لے کر کانپے بغیر حرکت

رہے اور ہم نے اس میں (بحری، بری اور فضائی) کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ اپنی اپنی منازل سفر تک جاسکیں اور ہم نے آسمانی کائنات کو محفوظ چھت بنایا۔ اور (کیا) وہ اس کی نشانیوں سے

يُؤْمِنُونَ ۝ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ

أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۝ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا

سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ وَجَعَلْنَا

السَّمَاءَ سَفًّا مَحْفُوظًا ۝ وَهُمْ

عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ ۝ وَهُوَ الَّذِي

خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ

وَالْقَمَرَ ۝ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۝

أَفَأَنْ مِتَّ فَهُمْ الْخَالِدُونَ ۝

(الانبیاء، ۳۰-۳۲)

اب بھی روگرداں ہیں؟ اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند جو اپنے مدار اور فلک میں گردش پذیر ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر (ارضی مخلوق) کو ایسی ہمیشگی اور دوام نہیں بخشا کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پر بدلے یا ختم ہونے بغیر قائم رہی ہو۔ اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ طعنہ زنی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے؟

۲- وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ

خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ

الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللَّهُ آخِذٌ بِكُمْ

مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ

فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝ وَاللَّهُ

جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِتَسْلُكُوا

مِنْهَا سُبُلًا ۝ فِجَاجًا ۝

(GENEOLOGICAL TREE) کی طرح اٹھایا۔ پھر وہ

تمہیں اسی میں لے جائیگا۔ اور تمہیں دوبارہ نئی

زندگی کے ساتھ باہر نکالے گا اور اللہ نے تمہارے

(نوح: ۱۴-۲۰)

لیے زمین کو بچھایا ہوا قطعہ بنایا۔ تاکہ تم اس کے
کشادہ راستوں پر چلو۔

اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو
کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں یعنی چھ ادوار
میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش یعنی کائنات کے تخت
اقتدار پر جلوہ افروز ہوا۔ اسے چھوڑ کر نہ تمہارا کوئی
کار ساز ہے نہ سفارشی۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں
کرتے؟ وہ اپنے اوامر اور معاملات کی تدبیر آسمان
سے اس لیے کرتا ہے کہ زمین یعنی نچلی کائنات میں
ان کا نفاذ اور تعمیل ہو، پھر وہ امور رفتہ رفتہ
اسی کی طرف اوپر اٹھاتے جائیں گے۔ اس تدبیر کی
مرحلے کی تکمیل ایک دن (ONE ERA OF

EVOLUTION) میں ہوگی جس کا عرصہ تمہارے
شمار کے مطابق ہزار سال پر محیط ہے۔ وہی ہر
نہاں اور عیاں کا جاننے والا (اور) عزت و رحمت والا
ہے۔ جس نے ہر اس چیز کو، جسے اس نے پیدا کیا،
(اس کے حال کے مطابق) نہایت احسن اور
مناسب صورت میں تشکیل دیا۔ اور اس نے

۳۔ اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۗ مَا لَكُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۗ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ۗ يَدْبِرُ الْاَمْرَ مِنَ
السَّمٰوٰءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يُعْرِجُ
اِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ
سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۗ ذٰلِكَ عَلِمُ
الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيْمُ
الَّذِي اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ وَبَدَا
خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۗ ثُمَّ جَعَلَ
نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ ۗ
ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ
وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۗ
قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۗ

(السجده: ۴-۹)

انسانی تخلیق کی ابتداء زمین کی مٹی یعنی غیر نامی مادے (INORGANIC MATTER) سے کی،
پھر اس کی نسل کو کمزور اور بے قدر پانی (DESPISED FLUID) کے نچوڑ سے چلایا۔ پھر اس وجود کو
صحیح شکل و صورت دی اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ یعنی اسے زندگی عطا کی، بعد ازاں
تمہیں سماعت اور دل و دماغ (PHYSICAL AND MENTAL FACULTIES) سے نوازا
لیکن تھوڑے لوگ ہی ان نعمتوں پر شکر بجالاتے ہیں۔ یعنی ان کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔

اگر آپ مذکورہ بالا تین مقامات پر ہی غور و فکر کریں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ

طبیعیات (PHYSICS) اور حیاتیات (BIOLOGY) کے جملہ مسائل پر اصولی اور بنیادی رہنمائی

قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی اسی وسعت علمی کا نام "جامعیت" ہے، جو اس کی وجہ تسمیہ ہے

پانچویں شہادت — قرآن تمام نقلی فنون کا ماخذ ہے | علوم و فنون کے اعتبار سے

سے جامعیت قرآن کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ علماء اسلام نے جملہ علوم کی انواع و اقسام سب قرآن حکیم سے ہی اخذ کی ہیں۔ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں جب علوم و فنون کی باقاعدہ تقسیم اور علوم فن کی تفصیلات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیا جانے لگا تو علماء کی ایک جماعت نے لغات و کلمات قرآن کے ضبط و تحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لے لیا۔ اس نے مخارجِ حروف کی معرفت، مد کلمات کا شمار سورتوں اور منزلوں کی گنتی، سجدات و علاماتِ آیات کی تعداد و تعیین، حصر کلمات، متشابہہ و متماثلہ آیات کا احصار، الغرض نعرض معانی و مطالب کے بغیر جملہ مسائلِ قرآت کا کام سرانجام دیا۔ ان کا نام قرء رکھا گیا اور اس طرح ”علم القراءۃ و المتجوید“ منصفہ شہود پر آیا۔ بعض نے قرآن کے معرب و مبنی، اسماء و افعال اور حروفِ عاملہ و غیر عاملہ وغیرہ کی طرف توجہ کی تو ”علم النحو“ معرض وجود میں آیا۔ بعض نے الفاظِ قرآن، ان کی دلالت و اقتضاء اور ان کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات بیان کیں تو ”علم التفسیر“ وجود میں آیا۔ بعض نے قرآن کے ادلہ عقلیہ اور شواہد نظریہ کی جانب التفات کیا اور اللہ تعالیٰ کے وجود و بقا، قدم و وجوب، علم و قدرت، تنزیہ و تقدیس، وحدانیت و الوہیت، وحی و رسالت، حشر و نشر، حیات بعد الموت اور اس قسم کے دیگر مسائل بیان کیے تو ”علم الاصول“ اور ”علم الکلام“ وجود میں آئے۔ پھر انہی اصولیتیں میں سے بعض نے قرآن کے معانی خطاب میں غور کیا اور قرآنی احکام میں اقتضار کے لحاظ سے عموم و خصوص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ، اطلاق و تقيید، نص، ظاہر، مجمل، محکم، نحفی، مشکل، متشابہ، امر و نہی اور نسخ و غیرہ میں کلام کیا، انواعِ قیاس اور دیگر ادلہ کا استخراج کیا تو فن ”اصول فقہ“ تشکیل پذیر ہوا۔ بعض نے قرآنی احکام سے حلال و حرام کی تفصیلات و فروعات طے کیں تو ”علم الفقہ“ یا ”علم الفروع“ کو وجود ملا۔

بعض نے قرآن سے گزشتہ زمانوں اور امتوں کے واقعات و حالات کو جمع کیا اور آغازِ عالم سے قیامت تک کے آثار و وقائع کو بیان کیا۔ اس طرح ”علم التاریخ“ اور ”علم القصص“ وجود میں آئے۔ بعض نے قرآن سے حکمت و موعظت، وعدہ و وعید، تحذیر و تبشیر، موت و معاد، حشر و نشر، حساب و عقاب اور جنت و نار کے بیانات اخذ کیے۔ جس سے ”علم التذکیر“ اور ”علم الوعظ“ کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے مختلف خواب اور ان کی تعبیر کے اصول اخذ کیے تو ”علم تعبیر الرؤیا“ کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے ”علم المیراث“ اور ”علم الفرائض“ کی تفصیلات بیان کیں۔ بعض نے رات، دن، چاند سورج اور ان کی منازل وغیرہ کے قرآنی ذکر سے ”علم المواقیت“ حاصل کیا۔ بعض نے قرآن کے

حسنِ الفاظ، حسنِ سیاق، بدیعِ نظم اور اطباء و ایجاز وغیرہ سے ”علم المعانی“، ”علم البیان“ اور

علم البدیع کو مدون کیا۔ عرفاء کا ملین نے قرآن میں نظر و فکر کے بعد اس سے معانی باطنہ اور دقائق مخفیہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس سے تزکیہ و تصفیہ، فنا و بقا، غیبت و حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کے حقائق و تصورات بھی اخذ کیے۔ جن سے "علم التصوف" کی تشکیل ہوئی۔

بعض علماء نے قرآن سے طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر و مقابلہ، نجوم اور مناظرہ وغیرہ کے علوم و فنون اخذ کیے اور ان کی تفصیلات بھی طے کیں۔ اس طرح یہ مقدس اور جامع الہامی کتاب بالفعل دنیا کے ہر فن اور علم کے لیے منبع و سرچشمہ قرار پا گئی۔

امام موسیٰ نے مزید تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کی تلخیص امام جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں کی ہے۔ الغرض دنیا میں موجود ہر فن و صنعت جو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی کی بقا و دوام اور فروغ و ارتقاء کے لیے ضروری ہے اصلاً قرآن سے ثابت ہے۔ علوم و فنون کے حوالے سے قرآن مجید کی جامعیت کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو محض ذکر و عبادت اور اخلاق و روحانیت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ دنیا میں ہر قسم کی علمی، فنی، صنعتی، سائنسی اور فوجی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرتا ہے تاکہ ملت اسلامیہ ایک ہمہ گیر ترقی پسند امت کے طور پر ابھرے اور آفاقی سطح پر انقلاب برپا کر کے عظیم مقام حاصل کر لے۔ کیونکہ اس کے بغیر عالمگیر غلبہ حق کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسی کی نشاندہی قرآن نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے فرمادی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے :-

هُوَ الَّذِي آدَسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ
الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ
كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ
(الصف، ۹)

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولِ معظم کو ہدایت اور
دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا کہ اس نظامِ حق کو دنیا
کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ بیشک مشرک یعنی
کفر و طاعت کے علمبردار اس کی مخالفت کرتے رہیں۔

اسی جامعیت کی بنا پر ربِّ ذوالجلال نے اس مقدس کتاب کا نام "القرآن" رکھا۔ کیونکہ انبیاء ماسبق کے زمانوں میں وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک الہامی کتاب کا بدل اگلے زمانے میں بنی نوعِ انسان کو کسی دوسری الہامی کتاب یا صحیفے کی صورت میں میسر آ رہا تھا۔ اس لئے ان کتابوں کو اس قدر جامع بنانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کسی کتاب کو ہمیشہ کے لیے اس حیثیت میں باقی رہنا تھا۔ لیکن ان کے برعکس خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بعد نہ کوئی اور نبی یا رسول آ سکتا تھا اور نہ قرآن کے بعد کوئی آسمانی وحی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو آفاقی، کائناتی، ابدی، کُلّی، حتمی، قطعی اور آخری بنانے کے لیے ہر اعتبار سے کامل اور

جامع بنایا جائے اور اس طرح وہ کتاب جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اسے بھی عالمگیر اور ابدی بنانے کے لیے اس قدر جامع کیا جائے کہ انسانیت کو سب کچھ اس کتاب کے دامن سے میسر آسکے اور کسی کو دوسری سمت میں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے۔ لہذا قرآن اپنی جامعیت کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے :-

يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ
قِيَمَةٌ

وہ اس قرآن کی تلاوت کرتا ہے جو ایسا مقدس صحیفہ آسمانی ہے کہ اس میں تمام آسمانی کتب کے علوم، ان کے ثمرات و مطالب اور حیاتِ انسانی کے تمام مفید و صحیح ضابطے درج ہیں۔

(البینۃ، ۲-۳)

کوئی ضرورت کی چیز جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہو قرآن سے خارج نہیں۔ باوجود قلتِ حجم کے اس میں وہ تمام علوم و معارف بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا احصار و استيفار کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ خود قرآن اعلان کرتا ہے :-

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٍ
وَالْبَحْرِ يَمْدُهِ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعُ
أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر ان کی سیاہی۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (یعنی کلامِ الہی کی وسعت و جامعیت کا احاطہ نہیں ہو سکے گا) بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

(لقمن، ۲۷)

قرآن مجید کے اسی اعجازِ جامعیت اور ابدی فیضان کا ذکر کرتے ہوئے امام جلال الدین سیوطی نے نقل کرتے ہیں :-

كالبدري من حيث التفت رايته يهدى الى عينيك نوراً شاقباً

كالشمس في كبد السماء وضوؤها يفتش البلاد مشارقاً ومغارباً

(قرآن چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے تو اسے جس طرف سے بھی دیکھے وہ تیری آنکھوں کو چمکتا ہوا نور عطا کرے گا۔ یہ قرآن آفتاب کی طرح آسمان کے وسط میں ہے۔ لیکن اس کی روشنی دنیا کے مشارق و مغارب سب کو ڈھانپ رہی ہے)

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ امر اچھی طرح آشکار ہو گیا ہے کہ قرآن کی پہلی وجہ تسمیہ اس کی معنوی جامعیت ہے۔ جو آج تک اس شان سے دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکی۔

لفظ قرآن کا دوسرا مادہ اشتقاق - قَرَنَ | لفظ قرآن کا دوسرا مادہ اشتقاق قَرَنَ

ہے جس کے معنی اکٹھا کرنے اور ملانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے :-

قَرَنَ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ اس شخص نے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملا دیا

لندا ۱۔ (لِقُرْآنٍ پر قَرَنَ کے لغوی معنی کا اطلاق اس طرح ہوگا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی ہر سورت دوسری سورت کے ساتھ، ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ، ہر لفظ دوسرے لفظ کے ساتھ اور ہر حرف دوسرے حرف کے ساتھ اس طرح متصل ہے کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔

امام ابو الحسن اشعریؒ اور ان کے اتباع اسی نقطہ نظر کی تائید فرماتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی نے امام سفیان ثوریؒ کا ایک قول یوں نقل فرمایا ہے :-

سَمَى الْقُرْآنَ قَرَانًا لِأَنَّ الْحُرُوفَ جَمَعَتْ فِصَارَتِ كَلِمَاتٍ ، وَالْكَلِمَاتُ جَمَعَتْ فِصَارَتِ آيَاتٍ ، وَالْآيَاتُ جَمَعَتْ فِصَارَتِ سُورًا ، وَالسُّورُ جَمَعَتْ فِصَارَتِ قُرْآنًا ، ثُمَّ جَمَعَ فِيهِ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ

قرآن کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا کہ حروف آپس میں ملائے گئے تو کلمات بنے، کلمات ملائے گئے تو آیات بنیں، آیات ملائی گئیں تو سورتیں بنیں اور سورتیں باہم ملائی گئیں تو قرآن بنا، پھر اس میں اولین و آخرین کے سب علوم جمع کر دیئے گئے۔

(تفسیر کبیر جلد ۱ ص ۲۳۸)

ب۔ قَرَنٌ سے ہی "اقتران" ہے جو باب افتعال سے مصدر ہے اور ازدواج کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جوڑے کے مل جانے اور دو کے اکٹھا ہوجانے (UNION AND CONJUNCTION) کو عربی زبان میں ازدواج کہا جاتا ہے۔ جب تک ازدواجیت رہتی ہے، خاوند اور بیوی کی علیحدگی منظور نہیں ہوتی اور جو نہی یہ الگ ہوتے ہیں رشتہ ازدواج باقی نہیں رہتا۔ امام راغب اصفہانیؒ المفردات میں فرماتے ہیں کہ ازدواج کی یہی معنویت اقتران میں بھی موجود ہے۔

اس اعتبار سے قرآن کا معنی کسی چیز کے ساتھ اس کتاب کا ایسا اتحاد اور اتصال یعنی اقتران و ازدواج ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن نہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے :-

قَرْنَتِ الْبَعِيدَ بِالْبَعِيدِ اِی جَمَعَتْ مِیْنِ نَے اِیْکِ اَوْنَطَ کُو دُو سَرِے کَے سَا تَحْہَ مَلا کَر بَا نَدِہَ دِیَا بَیْنَهُمَا

قرآن کا قرن سے مشتق ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اسے کسی وصف کے ساتھ اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ دونوں

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔

ج۔ اسی طرح قَرْنٌ سے "القرآن" بھی نکلا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

القرآن الجمع بین الحج والعمرة (المفرد) قرآن حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنے کا نام ہے اس مادے کے تمام مشتقات میں اتصال اور باہم پیوستگی کا مفہوم موجود ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خوبی اور وصف ہے جو قرآن کے ساتھ اس حد تک متصل اور پیوست ہے کہ اس میں اور قرآن میں دوئی یا علیحدگی کا کوئی تصور باقی نہیں رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ خوبی "ہدایت اور راستی" ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن سے اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ یہ اس سے جدا نہیں اور وہ اس سے جدا نہیں۔ یعنی قرآن اور راہ ہدایت کے درمیان فرق کرنا ہی ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ ان کی باہم پیوستگی کا عالم یہ ہے کہ خود قرآن کو عین "حق و ہدایت" سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ "ہدیٰ للناس" اور "ہدیٰ للمتقین" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ قرآن مجید نے اپنے متعدد اوصاف و خصائص بیان کیے ہیں۔ جن کا جائزہ لینے سے ہمیں مذکورہ بالا حقیقت کی مکمل تصریح میسر آ جاتی ہے۔

قرآن اور ہدایت کا باہم متصل ہونا | ۱۔ قرآن عظیم سب سے پہلے جس مقام پر اپنا تعارف کرانا ہے وہ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات ہیں :-

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ
(بقرہ ۲، ۳)

یہ وہ کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (اور) جو متقین کے لیے ہدایت ہے

یہاں تعارف قرآن کے سلسلہ میں ایک ہی خوبی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے اس کا ہدایت ہونا۔
۲۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :-

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ
(آل عمران، ۱۳۸)

یہ قرآن بنی نوع انسان کے لیے واضح بیان اور ہدایت ہے اور متقین کے لیے سراسر موعظت و نصیحت۔

اس آیت میں قرآن نے خود کو واضح بیان اور ہدایت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور خود کو موعظت و نصیحت کے عنوان سے بھی پیش کیا ہے۔

۳۔ تیسرے مقام پر قرآن اپنا تعارف یوں کراتا ہے :-

فَصَلِّنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَ رَحْمَةً
(اعراف، ۵۲)

ہم نے اس قرآن کو علم (بصیرت اور معرفت) کے ساتھ مفصل کر دیا اور یہ قرآن ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت و رحمت ہے۔

اس جگہ قرآن نے اپنے آپ کو مفصل علم کہا ہے اور اہل ایمان کے لیے خود کو سراسر ہدایت و رحمت کے نام سے موسوم کیا ہے۔

۴۔ ایک اور مقام پر قرآن اپنا تعارف یوں کرتا ہے :-

قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ
شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِينَ (یونس، ۵۷)

اے نسلِ انسانی! تمہارے رب کی طرف سے
تمہارے پاس موعظت و نصیحت آگئی اور جن
لوگوں کے سینوں میں بیماریاں ہیں اُن کے لیے
شفا ہے اور یہ قرآن اہل ایمان کے لیے ہدایت بھی
ہے اور رحمت بھی۔

یہاں قرآن مجید نے خود کو موعظت، شفا، ہدایت اور رحمت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

۵۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے :-

وَلَكِن تَصَدِّقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ
وَ تَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَ
رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ
(یوسف: ۱۱۱)

قرآن، جو کچھ انبیاء اپنے ساتھ لے کر آئے تھے
اس کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر شے
کی تفصیل ہے اور اہل ایمان کے لیے ہدایت
و رحمت ہے۔

یہاں تفصیل، تصدیق اور اہل ایمان کے لیے ہدایت و رحمت کے اوصاف گنوائے گئے ہیں۔

۶۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تَبْيَانًا لِّكُلِّ
شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى
لِّلْمُسْلِمِينَ
(النحل: ۸۹)

یہ قرآن جو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے کائنات
کے ہر ہر ذرے کا تفصیلی علم مہیا کرنے والا ہے
اور یہ ہدایت و رحمت ہے اور اہل ایمان کے لیے
بشارت بھی ہے۔

۷۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :-

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (الحج: ۲۰)

یہ نسلِ انسانی کے لیے بصیرت و تنبیہ ہے اور
ہدایت و رحمت ہے یقین والوں کے لیے۔

مذکورہ بالا سب آیات کا جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قرآن ہر جگہ اپنی خصوصیات اور حیثیات کا عنوان
بدلتا رہتا ہے لیکن ایک حیثیت شروع سے آخر تک بلا استثناء مذکور ہوتی چلی گئی ہے اور وہ "ہدایت" ہے

قرآن کی مختلف حیثیتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ گمراہوں کے لیے ہدایت ہے، نہ جاننے والوں کے لیے علم ہے۔

غافلوں کے لیے موعظت و نصیحت ہے۔ کم فہموں کے لیے واضح بیان ہے۔ بیماروں کے لیے شفا ہے۔

مایوسوں کے لیے بشارت ہے، پریشان حال لوگوں کے لیے رحمت ہے۔ سابقہ انبیاء کی تعلیمات اور ان

کی نبوتوں کے لیے تصدیق ہے۔ ابہام و اجمال کے لیے تفصیل ہے اور مجرموں اور ظالموں کے لیے

تنبیہ و بصیرت۔ الغرض قرآن کی مختلف حیثیتیں نسل انسانی کے مختلف طبقات کی ضرورتوں اور تقاضوں کے اعتبار سے ہیں۔ لیکن قرآن شفا ہوا نصیحت، رحمت ہو یا معظمت، تصدیق ہو یا تفصیل علم ہو یا تنبیہ۔ اس کا ہدایت ہونا ہر حیثیت میں یکساں طور پر کار فرما ہے۔ اسی لیے اس مقدس کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے:-

هَدَىٰ لِّلْمُتَّقِينَ

یہ متقین کے لیے سرسمر ہدایت ہے

یعنی ہم نے اس کتاب کے ساتھ اپنی ہدایت اور رہنمائی کو اس طرح متحد کر دیا ہے۔ کہ ہدایت سرسمر قرآن اور قرآن کا سرسمر ہدایت ہو گیا ہے۔ اور یہی لفظ قرآن کی وجہ تسمیہ ہے۔ اس لیے قرآن سب سے پہلا دعویٰ ہی یہی کرتا ہے کہ یہ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

قرآنی ہدایت کا دائرہ اثر | یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مقدس کتاب سے ہدایت صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کے زیور سے آراستہ ہوں یا عاصی اور خطا کار بھی قرآنی ہدایت سے استفادہ کر سکتے ہیں؟

اس کا جواب یوں ملتا ہے:-

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ
هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ
وَالْفُرْقَانِ

(البقرہ : ۱۸۵)

رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن کو نازل فرمایا۔ یہ بنی نوع انسان کے ایک ایک فرد کے لیے ہدایت ہے یہ خود ہدایت کیلیے روشن دلیل بھی ہے اور حق و باطل میں واضح امتیاز کرنے والا بھی۔

قرآن اپنے مقصد نزول کے تعارف کی نسبت سے تین جملے بیان کر رہا ہے اور تینوں جملے حقیقت ہدایت ہی کے تین مدارج و مراحل ہیں۔ پہلے فرمایا "هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے ایک عام انسان کے ذہن میں خلش پیدا ہوئی کہ "کیا قرآن سے پرہیزگاروں کے سوا عام انسان کو ہدایت میسر نہیں آسکتی؟" تو قرآن نے جواب دیا۔ هُدًى لِّلنَّاسِ۔ یہ نسل انسانی کے ہر فرد کے لیے بھی ہدایت ہے یہاں ہدایت سے مراد وہ روشنی ہے جس سے منزل مقصود کا تعین ہو سکے۔ قرآن نے اس کے بعد کہا کہ یہ صرف ہدایت کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ "وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ" یہ دعویٰ ہدایت کی دلیل بھی ہے۔

کیونکہ اس میں ہدایت کی روشن دلیلیں اور واضح ثبوت ہیں۔ گویا دعویٰ کے ساتھ اپنی صحت اور

حقانیت کی دلیلیں بھی قرآن میں ہی موجود ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ”والفرقان“ یعنی یہ ایسی ہدایت نہیں جس کے مل جانے کے بعد بھی حق و باطل میں سمجھوتے کا کوئی تصور باقی رہ سکے۔ یہ ایسی رہنمائی نہیں جس کے میسر آجانے کے بعد خیر و شر میں امتیاز نہ ہو سکے۔ ہم ایسی رہنمائی کو ہدایت ہی نہیں سمجھتے جو حق و باطل کے درمیان تفریق اور خیر و شر کے درمیان خد فاصل قائم نہ کر سکے۔ قرآن کہتا ہے کہ میری ہدایت وہ ہدایت ہے جس کے آجانے کے بعد حق، حق ہو جائے اور باطل باطل۔ پھر کسی اعتبار سے بھی خیر و شر اور صدق و کذب میں نہ کوئی امتزاج باقی رہتا، اور نہ اتحاد و یگانگت۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے اعلان فرمایا:-

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ
كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

تاکہ حق کو حق ثابت کر دے اور باطل کو باطل۔
بیشک مجرم اس امتیاز کو ناپسند کرتے رہیں۔
كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (انفال: ۸)

مزید ارشاد فرمایا گیا ہے:-

الرَّءِ كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ
النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
سے نکال کر ہدایت کے اُجالے تک پہنچادیں۔
(ابراہیم: ۱)

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے:-

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هِيَ
أَقْوَمُ (اسرار: ۹)

ایک اور مقام پر قرآن نے اپنے ہدایت ہونے کے ضمن میں فرمایا ہے:-

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ
فَمَنْ اهْتَدَى فَلِنَفْسِهِ
نازل کی ہے۔ پس جو کوئی اس قرآن سے ہدایت پائے
گا۔ اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچے گا۔
(الزمر: ۴۱)

قرآنی ہدایت ہر سطح پر خوف و غم سے نجات کی ضامن بھی ہے۔ اس وصف ہدایت کا بیان یوں کیا

کیا ہے:-

فَأَمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ
تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ (البقرہ: ۳۸)

اے نوع انسانی! جب میری طرف سے تمہارے
پاس ہدایت آجائے تو جو کوئی میری نازل کردہ
ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اس پر نہ کوئی خوف
ہوگا اور نہ کوئی غم۔

ایک اہم نکتہ

یہاں ایک اہم حقیقت کا بیان ضروری ہے کہ قرآنی فکر کے بعض علم برداروں نے قرآنی ہدایت کو اس طرح محصور و محدود کر دیا ہے کہ قرآن کی ہدایت انسان کو آخرت کے خوف و غم سے تو محفوظ کر سکتی ہے مگر اس دنیا کے خوف و غم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت اپنے دامن میں نہیں رکھتی حالانکہ اس آیت کا سیاق و سباق یہ کہہ رہا ہے کہ انسانیت کو اس دنیوی زندگی میں کچھ خطرات درپیش ہوں گے۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (بقرہ: ۳۶) اس دنیا میں تمہاری آپس کی عداوتیں ہونگی، باہمی بغض و عناد ہو گا لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں گے، لیکن یہ دشمنی اور عداوت کس بنیاد پر ہوگی؟

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (البقرہ: ۳۶) تمہیں ایک خالص مدت تک اس زمین پر رہنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کا حق دے دیا گیا ہے۔

تم میں سے کچھ لوگ چاہیں گے کہ دوسروں سے جینے کا حق چھین لیا جائے۔ مستحکم ہونے کا حق بھی سلب کر لیا جائے۔ جب کہ کچھ لوگ چاہیں گے کہ انسانیت کے یہ حقوق تمام و کمال محفوظ رہیں۔ گویا حق و باطل کے درمیان یہ ٹکراؤ اور محاذ آرائی جاری رہے گی حق و باطل کا یہ معرکہ نسلِ انسانی کو خوف و غم کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا کر دے گا۔ لیکن بنی آدم کو خوف و غم کی اس محیط کیفیت سے دنیا کا کوئی نظام نجات نہیں دے سکے گا۔ سوائے ہدایت ربانی کے۔ تعجب ہے کہ انسانی زندگی کو خطرات و خدشات تو اس دنیا میں پیش ہوں جبکہ قرآن کی ہدایت صرف آخرت میں ہی خوف و غم سے نجات دینے کا وعدہ کرے۔ یوں تو دشمنِ اسلام یقیناً یہی کہیں گے کہ اس دنیا میں (معاذ اللہ) شیطان نے خدا کو شکست دے دی۔ رہا آخرت کا حال تو وہ آخرت میں دیکھا جائے گا (معاذ اللہ) استغفر اللہ) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی وہ ہدایت جو آخرت کے خوف و غم سے نجات دے سکتی ہے اس سے پہلے اس دنیا کے ہر خوف و غم سے نجات دینے کی بھی ضامن ہے۔ لہذا یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ قرآن خود ایسی ہدایت ہے جو دنیوی اور اُخروی ہر قسم کے خوف و غم سے نجات دلانے کی ضامن ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ شاید قرآن صرف انفرادی سطح کی ہدایت مہیا کرتا ہے۔ اجتماعی اور بین الاقوامی سطح کی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ ایک فرد کی نجی زندگی سے لے کر قوم کی اجتماعی اور انسانیت کی عالمی زندگی تک کی ہدایت کا ضامن ہے۔

انفرادی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّ هَذِهِ تَذَكُّرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ

یہ قرآن ایسا ضابطہ نصیحت اور ہدایت کا

إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا

چارٹر ہے کہ جس شخص کا جی چاہے اس کا دامن

تھام کر خدا کی راہ کو پالے۔

(المزل: ۱۹)

قومی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّمَا لَدَيْكُمْ مَعْرُوفٌ لِّكُمْ وَلِقَوْمِكُمْ

(زخرف: ۲۴)

یا رسول اللہ! یہ قرآن آپ کے لئے اور آپ کی پوری قوم و ملت کے لیے ہدایت و نصیحت ہے۔

عالمی زندگی اور قرآنی ہدایت

إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ

یہ قرآن تمام عالم کے لئے ہدایت و نصیحت

(الانعام: ۹۱)

ہے۔

مذکورہ بالا شواہد سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ قرآن سے جو ہدایت حاصل ہوتی ہے وہ صرف نجی زندگی کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کے تمام احوال پر بھی محیط ہے۔ گویا قرآن اور ہدایت کا یہ اتحاد انسانیت کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اسے راہِ حق کے متلاشیو! اگر حق کی تلاش ہے تو قرآن کا دامن تھام لو۔ اس لیے کہ حق و ہدایت صرف قرآن کے ساتھ پیوست اور مختص ہے۔ یہی اعلانِ حقیقت لفظِ قرآن کا دوسرا معنی ہے۔

ہدایت کے مدارج و مراتب | قرآن جس ہدایت کا تصور دیتا ہے۔ اس کے تین درجے

ہیں ۱- عرفان الغایۃ ۲- ارادۃ الطریق ۳- ایصال الی المطلوب۔ راستہ دیکھنے کی طلب اور دکھانے کی ضرورت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک منزل کا شعور اور تعین نہ ہو۔ اس لیے ہدایت کا پہلا درجہ عرفان الغایۃ (منزل کی معرفت) ہے۔ غرض و غایت اور منزل مقصود کا تعین ہو جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ یہاں ہدایت کے دوسرے درجے ارادۃ الطریق (راستہ دکھانا) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے راستے کی راہنمائی ملتی ہے۔ اب قابلِ عمل امر یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کو منزل کا راستہ بتا دے اور منزل بہت دور ہو تو صرف راستہ بتا دینے میں کیا ضمانت ہے کہ آپ یقیناً منزل کو پالیں گے۔ ممکن ہے آپ آگے جا کر بھٹک جائیں۔ گویا راستہ بتا دینا ہدایت تو ہے لیکن ہدایت ناقصہ ہے کاملہ نہیں۔ اس لیے قرآن تیسرے درجے کی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے۔ جسے ایصال الی المطلوب (منزل تک پہنچا دینا) کہتے ہیں۔ گویا قرآن اور ہدایت کا ناہمی تعلق یہ ہے کہ منزل کا تعین کر دینے اور راستہ دکھا دینے کے بعد قرآن آپ سے لا تعلق نہیں ہو جاتا بلکہ ایسی ہدایت بھی مہیا کرتا ہے جو آپ کا بازو کپڑ کر منزل مقصود تک پہنچا دے۔ قرآنی ہدایت کا عالم یہ ہے کہ اگر کسی کو اپنی زندگی کے مقصد کا تعین درکار ہو تو یہ اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر کسی کو راستے کی تلاش ہو تو یہ اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اور اگر مقصد تک پہنچا درکار ہو تو قرآنی ہدایت مقصد تک پہنچانے کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔

ہدایت کے ان تینوں مدارج کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:-

وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ

(التغابن: ۱۱)

جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے دل کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔

یہ ہدایت کا پہلا درجہ ہے جسے عرفان الغایۃ یعنی شعور مقصد اور منزل کی معرفت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور مقام پر ہدایت کے دوسرے درجے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (البقرہ: ۱۲۲)

اللہ جسے چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔

یہ دوسرے درجے کی ہدایت تھی۔ جو صرف راستہ دکھانے سے متعلق ہے۔ تیسرے درجے کی ہدایت کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:-

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا (اعراف: ۴۳)

تمام تعریف اس رب کی ہے جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچا دیا۔

گویا قرآن ہر درجہ ہدایت کے اعتبار سے انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن نسل انسانی کے ہر طبقے کو دعوت دے رہا ہے کہ جس کو جس طرح کی رہنمائی کی ضرورت ہو مجھ سے حاصل کر لے۔ کیونکہ شعور و نصیحتیں کی بیداری بھی تمسک بالقرآن سے ممکن ہے اور حصول منزل بھی اسی سے۔ آج مشرق و مغرب کی جملہ اقوام بالعموم جس تشدد و افتراق، اضطراب و التہاب اور اخلاقی بے راہروی کا شکار ہیں قرآنی ہدایت سے فیضیاب ہوئے بغیر اس سے نجات نہیں پاسکتیں۔ ملت اسلامیہ، جس کا اعتماد اس دورِ زوال میں قرآنی ہدایت کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی پر بحال نہیں رہا۔ افکار و اغیار کی در یوزہ گری کرنے لگی ہے قرآن کا نام لینے والے اس دنیا کے لیے قرآن کو عملاً صحیفہ ہدایت نہیں سمجھ رہے۔ ہماری فکری قیادتیں بالعموم ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو چکی ہیں اور نتیجہ قرآنی فکر کو احقاق حق کے بجائے باطل سے سمجھوتے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر حق اور باطل کا صحیح امتیاز پیش نظر رکھ کر ہر قسم کی ہدایت فی الواقع قرآن ہی سے طلب کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ملت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا کھویا ہوا وقار بحال نہ کر سکے۔

قرآن پڑھنے کے باوجود گمراہی کا امکان | قرآن صحیفہ ہدایت ہے لیکن ملت اسلامیہ میں کتنے

لوگ ایسے ہیں جو قرآنی فکر کا نام لے کر بھی اس سے دُور جا رہے ہیں اور قرآن پڑھ کر بھی گمراہی کے راستوں پر چل رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں قرآن ہی سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ کیونکہ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں بیشمار طبقے ایسے ہو گزرے ہیں۔ جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے لیکن علی التحقیق گمراہ قرار دیئے گئے۔ مثلاً خوارج، معتزلہ، مرجیہ، باطنیہ وغیرہم۔ یہ سب قرآن سے استدلال کرتے تھے۔ مگر ظاہراً تمسک بالقرآن کے باوجود گمراہ ہو گئے۔ آج بھی مسلمانوں میں فکری سطح پر اٹھنے والی کمی الحادی اور انحرافی تحریکات

اپنے اپنے نقطہ نظر کو قرآن ہی سے مانو قرار دیتی ہیں لہذا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا محض دعویٰ کسی کے لیے سندِ صحت و صداقت نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری زمانے میں کسی ایسے فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں بعض لوگوں کو قرآن اور عبادات سے ظاہری تمسک کے باوجود لادین اور گمراہ قرار دیا گیا ہے۔ لہذا جو لوگ اپنی فکر و دانش کو حرفِ آخر اور عقلِ کل سمجھتے ہیں اور ہر بات کی صحت و عدم صحت یا حق و بطلان کا فیصلہ صرف اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ وہ بد نصیب قرآن پڑھ سُن کر بھی قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قرآن فہمی اور قرآن دانی صرف اپنے افکار ذہنی کی تائید اور اپنی خواہشات نفسانی کی تسکین سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا ظاہراً کثرت سے قرآن پڑھنا، ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اپنے باطنی فسق اور ذہنی آمریت کے باعث قرآن کے اسی حکم سے جس سے اہل اطاعت ہدایت پاتے ہیں، گمراہی حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہی کی نسبت ارشاد فرمایا گیا ہے: ”وَ يُضِلُّ بِمِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِمِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِمِ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ“ (اور وہ اسی سے بہتیروں کو گمراہ کرتا ہے۔ اور بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے۔ اس سے انہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے جو پہلے ہی فاسق ہیں) یہ امر ذہن نشین رہے کہ فسق بعض اوقات نماز روزہ اور تلاوت قرآن کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

بیشک اس کے ساتھی ایسے ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازوں کو حقیر اور قلیل جانو گے اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ قرآن (کثرت سے) پڑھیں گے مگر ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر کمان سے۔

فَانْ لِّهٖ اَصْحَابًا يَحْقِرُوْنَ اِحْدٰىكُمْ صَلٰوٰتِهٖ
مَعَ صَلٰوٰتِهِمْ وَصِيَامِهٖ مَعَ صِيَامِهِمْ
يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ لَا يَجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ
يَمْرُقُوْنَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ
مِنَ الرَّمِيَةِ

(البخاری ج ۲ ص ۱۰۲۲، مشکوٰۃ المصابیح

ج ۲ ص ۵۲۶-۵۲۷)

ایک اور مقام پر انہی لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی
مگر ان کے دل، بھیڑیوں کے ہوں گے۔

السَّنْتَهُمُ اِحْلٰى مِنَ السُّكْرِ وَقُلُوْبُهُمْ

قُلُوْبُ الذِّيَابِ (ترمذی ج ۲ ص ۶۳)

قرآن سے غلط استدلال کر کے گمراہ ہونے والے علماء کی بھی نشاندہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان الفاظ میں فرمائی ہے :-

حضرت حذیفہ بن یمان فرماتے ہیں۔ رسول اللہ

عَنْ حذِيْفَةَ ابْنِ الْيَمَانِ وَ قَالَ قَالَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ متّما
انخوف علیکم رجل قرأ القرآن حتی اذا
رؤیت بهجتہ علیہ وکان رداؤہ الاسلام
اعتزاه الی ما شاء اللہ انسلخ منه ونبذہ
وراء ظہرہ وسمی علی جارہ بالسیف و
رماہ بالشربک قال قلت یا نبی اللہ ایہما
اولی بالشربک المرئی او التّامی
قال بل التّامی

(تفسیر ابن کثیر، ج ۲ ص ۲۶۵)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں
مجھے جن امور کا خدشہ ہے۔ ان میں سے ایک یہ
ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہوگا جو قرآن بہت
پڑھے گا۔ حتیٰ کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور
پر سیراب ہوگا۔ اس کا اور ڈھنا بچھونا بھی اسلام ہوگا
اللہ تعالیٰ اسے کسی ایسے عیب یعنی زعم میں مبتلا
کر دے گا کہ قرآنی اثرات اس سے جدا ہو جائیں
گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پس پشت ڈال کر اپنے
قرب و جوار کے مسلمانوں کو مشرک
قرار دے گا اور ان کے قتل کے درپے ہوگا۔ حضرت

حذیفہ فرماتے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک
کون ہوگا۔ مشرک کہنے والا یا وہ جس کو مشرک کہا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ دوسرے کو مشرک کہنے والا خود
مشرک ہوگا۔

یہ حدیث سنید امام ابو یعلیٰ میں روایت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور دیگر ائمہ و
محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے۔ الغرض اس حدیث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا
کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے کے باوجود قرآن سے غلط استدلال کر کے اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو گمراہ اور
مشرک ٹھہرائیں گے۔ حالانکہ یہی سوچ ان کی اپنی گمراہی ہوگی۔ کیونکہ باطن میں فسق ہو اور سینہ و دل انوارِ
معارفِ قرآنی سے خالی ہوں تو قرآن کا مطالعہ بھی ایسے بد نصیبوں کے لیے گمراہی کا باعث بن جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی حفظ و امان میں رکھیں۔ (آمین)

اس حقیقت کی تائید حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاری نے روایت
کیا ہے :-

ابن عمرؓ ان لوگوں کو مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ
شریر تصور کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ ان قرآنی آیات
کو جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھیں بڑی
آزادی اور جرأت مندی کے ساتھ مسلمانوں پر چپال
کرتے ہیں۔

وکان ابن عمر یراہم شرار خلق اللہ و
قال انہم انطلقوا الی آیات نزلت فی
الکفار فجعلوها علی المؤمنین
(بخاری جلد ۲ ص ۱۰۲۲)

مذکورہ بالا احادیث و آثار سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ ہمیشہ کچھ لوگوں کا

طریق کاری رہا ہے کہ پہلے اپنے خود ساختہ فکر اور مزعومہ مفادات کے تحت عمت اند تراش لیتے ہیں اور پھر قرآنی آیات کو تاویل و تحریف کے ذریعے اپنے وضع کردہ خیالات اور نقطہ ہائے نظر پر منطبق کرنے کا نام تفسیر اور فکر قرآن رکھ دیتے ہیں۔ گویا خود قرآن کے تابع نہیں بلکہ قرآن کو اپنے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کے بعض علماء کا بھی تھا۔ جن کی قرآن حکیم میں یوں مذمت کی گئی ہے:-

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يَحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ
مَاعَقَلُوهُ (البقرة، ۷۵)

اور بیشک ان میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا تھا جو
کلام الہی سُننے لگتے تھے۔ پھر اسے سمجھ لینے کے بعد
(معنوی طور پر) بدل دیتے تھے۔

ایسے لوگوں کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آیات کی تلاش رہتی ہے اور انہیں کے حوالے سے اپنے موقف کی تائید کو خدمت قرآن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اس سلسلے میں ابو عثمان النہدی کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ بنی ربیع یا بنی تمیم میں سے ایک شخص نے آپ سے الذاریات والمرسلات والنازعات یا ان میں سے بعض کے متعلق سوال کیا، یہ استفسار ظاہر قرآن فہمی کی خاطر ہی تھا۔ لیکن آپ نے فرمایا:-

ضع عن راسك ، فاذا له وفره فقال
عمر اما والله لرأيتك محلوفا للضربت الذی
فیہ عیناک (الصائم المسلول، ۱۸۸)

اپنے سر سے کپڑا ہٹا اس نے منہ زنگا کیا تو سر پر بال تھے۔
یعنی سر منڈا ہوا نہ تھا۔ آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر
یہ سر منڈا ہوا ہوتا تو میں اسے قلم کر دیتا۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ اس شخص نے سوال تو قرآن مجید کی سورتوں کا معنی و مفہوم جاننے کے لیے کیا تھا۔ اس سے اس کا قرآنی تعلیمات اور ان کی تفہیم لگاؤ ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن سیدنا فاروق اعظمؓ کا رد عمل کچھ اور نکلا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ایسے لوگ موجود تھے جو بکثرت قرآن پڑھتے تھے اور اس کے فہم و بیان کا دم بھی بھرتے تھے۔ لیکن ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ارباب بصیرت اور صحابہ کبار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان لوگوں کا تمسک بالقرآن محض دھوکہ و فریب ہے۔ قرآن ان کی زبانوں پر ہے سینوں میں نہیں اور یہ اس قسم کے استفسارات خاص زاویہ نگاہ سے کرتے ہیں۔ ان کا ارادہ کچھ اور ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی علامات بھی بیان فرما دی تھیں۔ یہ خوارج ہی تھے جو اسلام اور قرآن ہی کے نام پر ملت اسلامیہ کو تفرقہ و انتشار میں مبتلا کر رہے تھے ان کا مطلق نظر بجائے کفار و مشرکین سے برسر پیکار ہونے کے خود صحابہ تابعین اور امت مسلمہ کے سوا اعظم کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے محاذ آرائی اور قتل و غارت تھا۔ اسلام کی پہلی صدی کی تاریخ اور بالخصوص دور خلافت علیؓ کے حقائق و واقعات ان شواہد پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کی علامات میں سے بالعموم حدیث نبویؐ کے مطابق، دھنسی ہونی آنکھیں، ابھرے ہوئے گال، ٹخنوں سے اوپر تہ بند، گھسنی دارھی اور سر

منہج وانا تھا۔ سیدنا عمرؓ کو اس سائل کی نسبت یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ خارجی ہو۔ اس لیے اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر اسے سزنگا کرنے کو کہا۔ لیکن سرمنہج اہوانہ دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے خارجی نہ ہو۔ لہذا یقین کے بغیر اسے قتل نہیں کیا۔ تاریخی شواہد سے یہ امر ثابت ہے کہ۔ **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ** (حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے) اور **لَا حُجَّةَ إِلَّا لِلْقُرْآنِ** (قرآن کے سوا کوئی چیز حجت نہیں) جیسے نعرے جو بظاہر بڑی دینی حیثیت پر دلالت کرتے ہیں۔ خود اسلام میں فتنہ و شر پیدا کرنے کے لیے لگائے جاتے رہے ہیں۔ اگر خدا اور قرآن کے نام پر تاریخ اسلام کے دورِ اوائل میں گمراہی پھیلانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں تو آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد جب کہ اخلاقی اقدار بھی زوال و انحطاط کا شکار ہو چکی ہیں ایسے فتنوں سے سادہ لوح مسلمانوں کو دام فریب میں کیوں مبتلا نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن سے ہدایت پانے کا حتمی طریقہ | اندریں حالات یہ ضرورت زیادہ شدت کے ساتھ

محسوس ہوتی ہے کہ اہل اسلام کو راہ ہدایت پر گامزن ہونے اور گمراہی و ضلالت سے محفوظ رہنے کی کوئی حتمی سبیل معلوم ہونی چاہیے۔ تاکہ وہ مختلف قسم کے دلفریب اور خوشنما دعویوں سے متاثر ہو کر جگہ جگہ بھٹکتے نہ پھریں آئیے ہم قرآن سے اس اصول اور ضابطے کو تلاش کرتے ہیں جسے اپنا کراخذا ہدایت کی ضمانت میسر آجائے۔ قرآن حکیم اس سوال کا جواب کہ کون سی راہ راہ ہدایت ہے؛ سورۃ الفاتحہ میں مرحمت فرماتا ہے۔ یہ وہ سورت ہے جس نے انسانوں کو رب ذوالعطا سے مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے۔ اس لیے اسے سورۃ الدعاء، سورۃ السؤل اور تعلیم المسئلہ بھی کہتے ہیں۔

قرآن حکیم کی سب سے پہلی آیت جو طلب ہدایت اور راہ ہدایت کی نشاندہی سے متعلق ہے۔ اسی سورت میں ہے۔ خدا کی حمد و ثناء کے بعد انسان کو بارگاہ ایزدی میں یہ سوال کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
اے اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ سیدھی راہ کا تعین کس طرح ہوگا۔ یہ کون بتائے گا کہ یہ راستہ سیدھا ہے۔ قرآن نے خود صراطِ مستقیم کی تعریف کر کے ہمیشہ کے لیے اس الجھن کو ختم کر دیا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ
ان لوگوں کا راستہ سیدھا ہے جن پر تو نے انعام کیا
ان لوگوں کا نہیں جن پر غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔

یہاں صراحت کے ساتھ خدا کے مقبول اور انعام یافتہ بندوں کے راستے کو راہ ہدایت سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اس قرآنی وضاحت سے اختلاف کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی، لیکن انعام یافتہ بندوں کا تعین پھر مسئلہ پیدا کر سکتا تھا۔ قرآن نے اس کو بھی یہ کہہ کر حل فرما دیا۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ
اور جو اللہ اور رسول کا حکم مانے اسے ان لوگوں کی
میت ملے گی جو اللہ کے انعام یافتہ ہیں اور وہ

وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (النسار، ۶۹) انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ یہ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

اس آیت میں خدا کے انعام یافتہ بندوں کو چار طبقات پر منقسم کر دیا گیا ہے۔ نبی، صدیق، شہید اور صالح، گویا نبوت، صدیقیت، شہادت اور صالحیت یہ چار اوصاف ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعام کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

لہذا "صراط الذین انعمت علیہم" کی قرآنی تفسیر یہ ہوتی کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صلحاء کا راستہ چونکہ خدا کے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے۔ اس لیے یہی راہ ہدایت ہے۔ قرآن حکیم کے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مذکورہ بالا چاروں طبقات کا راستہ دراصل ایک ہی راستہ ہے۔ ان میں قطعاً کوئی تفاوت اور مغایرت نہیں اور یقیناً یہی کتاب و سنت کا راستہ ہے۔

راہ ہدایت کا قرآنی تشخص :-

قرآن نے اس مقام پر راہ ہدایت کی تعریف کتاب و سنت کے الفاظ کے حوالے سے نہیں کی بلکہ متعدد دیگر مقامات پر اطاعت الہی اور اطاعت رسول کے الفاظ کی صورت میں کتاب و سنت سے تمسک و اعتصام کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ اسلام میں معیار حق و صداقت تو بلاشک و شبہ کتاب و سنت کی راہ ہی ہے اور کسی چیز کو ان کا بدل تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہاں اہل اسلام کو طلب ہدایت کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے اور انہیں راہ ہدایت پر گامزن ہونے کا یقینی ضابطہ بتلانا مقصود ہے۔ یہاں بھی احکم الحاکمین صاف لفظوں میں یہ فرما سکتا تھا کہ "سیدھا راستہ میری کتاب اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا ہے"۔ لیکن بجائے اس کے یہ کہا گیا کہ "سیدھا راستہ میرے انعام یافتہ اور مقبول بندوں کا راستہ ہے" ذرا غور کریں تو آپ کو "صراط مستقیم" کی تعریف میں دو پہلو نظر آئیں گے۔ مثبت اور منفی۔

صراط الذین انعمت علیہم مثبت راہ کی نشاندہی ہے۔ جب کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین منفی راہ کی۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور مانعیت بھی۔ اس قدر تفصیل میں جانے کے بجائے صاف صاف قرآن و سنت کے الفاظ استعمال ہوتے تو اس میں اختصار بھی ہوتا اور ایجاز بھی، لیکن ان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ "فعل المحکم لا یخلو عن المحکمة" (صاحب حکمت کا کوئی کام حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا) اس میں حکمت یہ ہے کہ راہ ہدایت ہے تو فی الحقیقت قرآن و سنت ہی کا راستہ لیکن قرآن و سنت کا صحیح مدعا و منشا خدا کے انعام یافتہ، مقبول اور صالح بندوں کی پیروی سے ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ محض اپنی رائے سے قرآن و سنت کے مطالب و مفاد متعین کرنے میں گمراہی کا امکان پایا جاتا ہے۔ یہی

اس آیت کا منشا ہے۔ "یضل بہ کثیراً و یهدی بہ کثیراً" یعنی جو لوگ صرف اپنی رائے

سے قرآن اور اس کی تمثیلات کو سمجھنا چاہتے ہیں گمراہ ہو جاتے ہیں اور جو اللہ کے انعام یافتہ بندوں کی رہنمائی سے سمجھنا چاہتے ہیں ہدایت پا جاتے ہیں۔

گویا ارشادِ ربّانی کے مطابق قرآن سے محض اپنی رائے کی بنا پر اکتسابِ علم کرنے والے گمراہی و ضلالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی تائید اس حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہوتی ہے:-

من قال فی القرآن برأیہ فقد اخطا
(ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

جس نے قرآن کا مفہوم اپنی ذاتی رائے سے متعین کیا، اس نے ٹھوکر کھائی۔

اس لئے مشیتِ ایزدی یہ تھی کہ الہامی ہدایت کے ساتھ ساتھ اس ہدایت کے مشخص نمونے بھی بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کیے جائیں۔ تاکہ لوگ خدا کے پیغام کو اسی کی منشا کے مطابق سمجھ سکیں۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو ہدایتِ ربّانی کا کامل نمونہ بنا کر مبعوث کیا جاتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ارشادِ ربّانی کا یہی مقصود تھا:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ
(الاحزاب، ۱۲۱)

بے شک تمہارے لیے رسول اللہ میں پیروی کے لیے بہترین نمونہ حیات ہے۔

بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی، حقیقی اسلام، حقیقی ایمان اور حقیقی تمسک بالکتاب بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے کیونکر ممکن ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔ باینہم یہ نہ ہو کہ قرآن براہِ راست بندوں کے پاس پہنچ جاتا۔ منکرین و مومنین اسے آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے لوگوں کو بلا واسطہ ہدایت عطا ہو جاتی۔ ہر شخص کے سر ہانے صبح کو قرآن کا ایک ایک نسخہ رکھا ہوا مل جاتا لیکن قدرت نے اس کے برعکس انسانی معاشرے میں ایک زندہ شخصیت کو پیدا فرمایا۔ اسے معاشرتی زندگی میں ہر قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم صادر فرمایا اور پھر اس کی وساطت سے لوگوں کو ہدایت بہم پہنچائی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو قرآنی ہدایت سمجھنے کا اہل بنانے کے لیے ان پر آیاتِ تلاوت کیں۔ ان کا تزکیہِ نفوس کیا۔ پھر انہیں تعلیم کتاب دی اور حکمت و دانائی کی دولت سے نوازا۔ قرآن اس طریقہٴ تعلیم و تربیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:-

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

رسول ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کے قلب و باطن کا تزکیہ فرماتے ہیں اور پھر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

(آل عمران، ۱۶۴)

صحابہ کرام کے سامنے قرآنی ہدایت کا مشخص نمونہ بھی تھا اور جملہ تفصیلات معلوم کرنے کا ذریعہ بھی۔ جسے سنتِ رسول کہا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کتاب و سنت کا پیغام نسلِ انسانی تک پہنچانے کے لیے ایسے نہ کیا کہ قرآن و حدیث کے بیشمار قلمی نسخے دیگر بلاد و امصار میں روانہ فرمادیتے تاکہ لوگ براہ

راست قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے سے تعلیمات اسلام کا صحیح شعور پیدا کر لیتے بلا آپ نے بھی سنت الہیہ پر عمل کرتے ہوئے مزید زندہ شخصیات کو پیدا فرمایا۔ ان کے سینے نور معرفت سے منور کیے انہیں اپنے نور صحبت سے مستنیر کیا۔ انہیں اپنے فیضان نظر سے اسلام کو سمجھنے کا اہل بنایا اور پھر اطراف و اکناف عالم میں روانہ کر دیا کہ لوگ قرآن و سنت کی تعلیمات ان زندہ شخصیتوں سے سیکھیں۔ یہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جو قرآن و سنت کی صحیح راہ بتانے والے تھے سب کون تھے، صدیقین و صالحین تھے۔ کیا اس دور کے مسلمان بذات خود قرآن و سنت سمجھنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ یقیناً انکی استعداد آج کے علما سے بہت زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ زندہ شخصیتوں کے محتاج تھے۔ قرآن و سنت کا علم رکھتے ہوئے بھی اکابر صحابہ و اہل بیت کی خدمت میں جاتے تھے اور یہی طریقہ بعد کے ادوار میں بھی ہمیشہ جاری رہا۔ ہر دور کے علماء قرآن و سنت کو ہی راہ ہدایت سمجھتے تھے۔ لیکن اس کا اصل تعین اور تشخص انہیں انہ و صالحین اور اکابر مجتہدین کے ذریعے ہی حاصل ہوتا تھا۔

مادی علوم میں آج کونسا علم اور دستکاری کے پیشوں میں آج کونسا پیشہ ہے جس میں استاد کی مدد اور ماہرین کی تحقیقات و تشریحات کی ضرورت نہیں۔ کیا قرآن و سنت کا علم ہی ایسا رہ گیا ہے جس میں بغیر اکابر علماء محققین اور صلحاء عالمین کی راہنمائی کے ہر کوئی اپنی رائے سے کلام کرتا پھرے۔ چونکہ اکابر ملت اور صلحاء امت قرآن و سنت سے ماخوذ ہدایت کے علمی و عملی نمونے تھے۔ اس لیے ان کے راستے کو قرآن نے راہ ہدایت قرار دیا۔ جس طرح صحابہ نے قرآن کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ کیا تھا اور نہ ہی اس کے نزول کو دیکھا تھا بلکہ انہیں اس کا حصول اور صحیح ادراک و معرفت نور نبوت کی وساطت سے نصیب ہوئی تھی اور جو اندیشہ ہدایت قرآنی کے عملی نمونے کے بغیر براہ راست مطالعہ قرآن سے اخذ ہدایت کی کوشش میں موجود تھا۔ وہی اندیشہ عہد رسالت کے بعد قیامت تک سنت نبوی کے کامل عملی نمونوں کے بغیر تفسیر بالرائے سے بھی ممکن ہے۔ کیونکہ بعد کے ادوار کے مسلمانوں نے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل اور اس کے مدعا کو براہ راست آپ سے حاصل نہیں کیا بلکہ بصورت مطالعہ اس سے آگہی حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن و سنت کے ہزاروں مسائل کا مفہوم تعبیر و تشریح کے ذریعے ہی متعین ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا ضابطہ اور اسلوب مقرر کر دیا جاتا جس سے قرآنی ہدایت کا اخذ و حصول اندیشہ ضلالت سے محفوظ ہو جائے اور امت مسلمہ کتاب و سنت کی ایسی تعبیرات کو اپنا سکے جو بالیقین حق و صواب ہوں۔ اس طرح قرآن نے الہامی ہدایت کا صحیح راستہ قیامت تک کے لیے متعین فرما دیا کہ ہر دور کے مقبول اور انعام یافتہ بندے اسی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا علم و عمل دراصل کتاب و سنت کا صحیح نمونہ ہے۔ اس لیے انہی کے راستے پر چل کر قرآن سے ہدایت طلب کی جائے۔

قرآن نے یہ فیصلہ دے کر امت محمدی کو فکری اضطراب و انتشار کے عذاب سے نجات دلادی ہے کہ جس

طرح قرآنی ہدایت اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مشخص کر دی گئی ہے۔ اسی طرح کتاب و سنت کا راستہ اُمتِ مسلمہ کے اکابر صلحاء کے راستے سے متعین و مشخص کر دیا گیا ہے۔

اس لیے فرمایا گیا۔ اے راہ ہدایت کے متلاشیو! میرے انعام یافتہ بندوں ابلیار، صدیقین، شہداء اور صلحاء کے راستے پر گامزن ہو جاؤ۔ یہی راہِ حق پرستی ہے۔ آج بعض ذہن اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر یوں سوچنے لگتے ہیں کہ شاید صلحاء اُمت کے عقائد و اعمال کا راستہ قرآن و سنت کے راستے سے الگ ہے۔ کیونکہ اکابر ائمہ و صالحین کی تحقیقات، تعبیرات اور تشریحات سُن کر وہ یہ کہتے ہیں کہ چھوڑیے ان کتابوں اور اقوال کو۔ صرف کتاب و سنت کی بات کیجئے۔ یہاں اسی مغالطے کا ازالہ ضروری ہے کہ ان صلحاء اُمت کی تعبیرات و تشریحات بھی تو کتاب و سنت ہی سے ماخوذ و مستفاد ہیں اور کتاب و سنت ہی کے احکام کی تفصیلات ہیں۔ انہوں نے کتاب و سنت کے مقابلے میں کئی نئی راہ نہیں دکھائی بلکہ وہ خالصتاً اسی ہدایت کے پیروکار رہے ہیں اور اسی کی اتباع سے اس کمال تک پہنچنے کے قابل ہوئے ہیں۔ قابلِ غور یہ امر ہے کہ ان صلحاء و عاملین کی تعبیرات کو چھوڑ کر جب ہم کتاب و سنت کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم خود قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط نہیں کر رہے ہوتے؟ کیا ہم خود احکام قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح نہیں کرتے؟ کیا ہماری بحث نصوص قرآنی کی اشارت، دلالت اور اقتضا سے نہیں ہوتی۔ کیا ہم عصری مسائل کا حل قرآن و سنت سے تلاش کر کے باقاعدہ آراء و خیالات کو ترتیب نہیں دیتے؟ کیا کتاب و سنت کی روشنی میں جو کچھ ہم درسوں، تقریروں، کتابوں اور تفسیروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عین نصوص قرآن ہیں یا ان کی تعبیرات و تشریحات؟ سوال یہ ہے کہ اگر ہم کتاب و سنت سے روشنی حاصل کر کے ہزاروں، لاکھوں مسائل پر خیالات آرائی کریں تو کیا یہ تحقیقی کام قرآن و حدیث کی راہ سے متصادم ہو گا یا اسی ہدایت کی پیروی اور خدمت متصور ہو گا؟ اگر قرآن و سنت سے ماخوذ ہمارا فکر و تحقیق قابلِ قبول ہے تو ان نفوسِ قدسیہ کے افکار و خیالات، جو سراسر قرآن و حدیث کی تعلیمات کے علمی و عملی پیکر تھے۔ کیونکر ناقابلِ قبول قرار پا گئے۔ اگر ان کی تحقیقات و تشریحات کو کتاب و سنت کا اصل مدعا و مفہوم سمجھنے کے لیے راہِ سنا تسلیم کیا جائے تو آخر اس میں کیا قباحت ہے حقیقت یہ ہے کہ عقائد و اعمال کے باب میں ان کا قول و عمل اس لیے بھی وقیع اور لائق التفات ہے کہ وہ ہماری نسبت عمد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب تھے اور ارشادِ نبویؐ:-

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم
سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا جو
میرے زمانے کے لوگوں سے ملے۔ پھر ان کا جو ان
لوگوں سے ملے۔ (ترمذی، ۲: ۵۳)

کے مطابق سب سے بہتر تھے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدی کے برگزیدہ اشخاص

کے ذریعے کتاب و سنت کی ہدایت میسر نہ آسکتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ:
 علیکم بسنتی و سنتی الخلفاء الراشدين تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت
 پر عمل کرنا ضروری ہے۔ (ابوداؤد، ۲: ۲۷۹)

یہ امر انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ جدید عصری مسائل مثلاً سیاسی، اقتصادی، قانونی، تعلیمی اور
 معاشرتی تقاضوں کے مطابق جس قدر نئی اجتہادی تعبیرات قرآن و سنت کی روشنی میں ہوتی رہیں گی۔
 اہل اسلام کے لیے قابل قبول اور قابل عمل ہوں گی۔ کیونکہ زندگی ارتقاء پذیر ہے اور جس طرح ان
 مسائل حیات میں تھرگ ہے۔ اسی طرح ان کے حل بھی بتقاضائے حالات ارتقاء پذیر رہتے ہیں۔ لیکن یہ
 اجتہاد و عقائد و عبادات کے باب میں ناجائز ہے کیونکہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ارتقاء اسلام سے
 انحراف و ارتداد کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لہذا عقائد و عبادات کے سلسلے میں سلف صالحین کی قرآنی تعبیرات و تشریحات کو ہی سند تسلیم کیا
 جائے گا۔ ایک اور مقام پر قرآن اور ہدایت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اس سے ہدایت حاصل کرنے کے
 طریقہ کی نشاندہی ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

بیشک تمہارے پاس ایک نور یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم اور ایک روشن کتاب یعنی قرآن آگیا۔ اس
 سے اللہ تعالیٰ اسی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی
 رضا کی پیروی کرتا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُبِينٌ
 يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ
 (المائدہ، ۱۵۱-۱۶)

گویا قرآن کا یہ بر ملا اعلان ہے کہ رضائے الہی کی پیروی کرنے والے بہ صورت و عدۃ ایزدی کے مطابق
 ہدایت سے سرفراز کیے جاتے ہیں۔ چونکہ مقام راضیہ و مرضیہ پر فائز مفلس نفوس بارگاہ الہیہ سے بہ صورت
 ہدایت کی نعمت پاتے ہیں اس لیے ان کے راستے کی پیروی بھی ہدایت بن جاتی ہے اور انہی سے فکری عمل
 وابستگی قرآنی ہدایت کے حصول کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے۔ مزید برآں اس امر کے یقین اور وثوق کی بنیاد
 ایک اور حکم قرآنی بھی ہے جہاں شیطان کے سجدۃ آدم سے انکار پر جنت سے نکل جانے کے فیصلے کا بیان
 ہے۔ اس موقع پر قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:-

ابلیس نے کہا۔ باری تعالیٰ تیری عزت کی قسم ہیں
 سب لوگوں کو گمراہ کروں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں
 قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا أُغْوِيَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ ۱۵
 عِبَادِكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ

کے جو برگزیدہ اور چنے ہوئے ہیں۔ (الزمر، ۸۲)

یہاں متذکرہ بالا حقیقت کی صراحت کر دی گئی ہے کہ خدا کے مقبول و برگزیدہ بندے اللہ تعالیٰ کے

خصوصی فضل و احسان سے ہمیشہ محمراہی سے محفوظ و مامون رہتے ہیں اور بنی نوع انسان کو راہ ہدایت بھٹکانے کے تمام حیلے اور بہانے صالحین و مخلصین پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ چونکہ انہیں رب العلمین کی طرف سے خصوصی امان اور حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ اس لیے ان کی فکری، علمی، اعتقادی اور عملی رہنمائی میں قرآن سے ہدایت اخذ کرنا ہی طلب ہدایت کا صحیح طریقہ ہے۔

لفظ قرآن کا تیسرا مادہ اشتقاق - قرآۃ
امہ لغت کا تیسرا قول یہ ہے کہ لفظ قرآن کا مشتق منہ قرآۃ ہے جس کا معنی پڑھنا ہے۔ اس لحاظ سے قرآن فعلان کے وزن پر اسم مصدر مہوز قرار پایا۔ چنانچہ اس کا معنی پڑھا گیا یا پڑھایا گیا ہوگا۔ لغت مشہور امام ابوالحسن علی بن حازم اللخانی اسی قول کی تائید کرتے ہیں جسے امام جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں رقم فرمایا ہے۔ قرآۃ کا مادہ بھی دراصل قرأ ہی ہے جو اکٹھا کرتے اور جمع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانی المفردات میں قرء او قرآۃ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

انه لا يقال للحرف الواحد قرأً یا قرآۃً ایک حرف کے پڑھنے کو نہیں کہتے۔
قرأت کا اطلاق کئی حروف اور کلمات کو ملا کر پڑھنے پر ہوتا ہے اس لیے قرآۃ کی تعریف یوں کی گئی ہے۔
القرآۃ ضم الحروف والكلمات حروف اور کلمات میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملا کر بعضہا الى بعض فی الترتیل (المفردات: ۲۰۲) پڑھنا قرآۃ کہلاتا ہے۔

قرآن حکیم اسی مفہوم کو اپنے لفظوں میں اس طرح ادا کرتا ہے۔
ان عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ ۚ فَاِذَا قُرْاْنَا۟ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ
بیشک اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔
پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس پڑھے ہوئے کی پیروی کیجئے۔
(القیامہ: ۱۷-۱۸)

امام رازی نے تفسیر کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے جس سے اس تصور کی تائید ہوتی ہے۔
ان القرات والقراءۃ واحدٌ كالخسران والخسارة۔
لفظ قرآن اور قرآۃ اصل میں ایک ہی چیز ہیں جیسے خسران اور خسارہ۔

علامہ زنجیزی نے تفسیر کشاف میں یہ بیان کیا ہے کہ لفظ قرآن لغت میں مصدر ہے اور قرآۃ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرأت الكتاب قرآناً (میں نے کتاب کو خوب اچھی طرح پڑھا) یہاں ایک اور پہلو انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ لفظ قرآن کے وزن پر آنے والے تمام مصادر میں ہمیشہ مبالغہ اور معنی کی کثرت پائی جاتی ہے۔ مثلاً رحم سے رحمان ہے جس کا معنی صرف رحم کرنے والا نہیں بلکہ بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ اس میں معنی رحمت کی کثرت اور مبالغہ موجود ہے۔ اسی طرح غضب سے غضبان اور عطش سے عطشان ہے جن کے معنی علی الترتیب بہت زیادہ غضبناک اور شدید پیاسا کے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآۃ سے قرآن کا فعلان کے وزن

پر وارد ہونا کثرتِ قرأت کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بنابریں قرآن سے مراد ”وہ کتاب ہے جسے بہت زیادہ پڑھا جائے۔“ جب ہم لفظ قرآن کی معنوی نسبت کو تاریخی شہادت کے پیمانے پر پرکھتے ہیں تو اسکی صداقت روز روشن کی طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی سلیم الطبع شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ تاریخ علم کے آغاز سے آج تک کوئی الہامی یا غیر الہامی کتاب اس قدر کثرت سے نہیں پڑھی گئی جتنا کہ قرآن مجید۔

قرآن مجید حفظ و ناظرہ، تجوید و قرأت، تلاوت و ترجمہ اور تفسیر و تعبیر کے لحاظ سے اس قدر کثرت سے پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے کہ اس سے بڑھ کر اس کی حقانیت پر کسی اور خارجی دلیل کی حاجت ہی نہیں رہتی۔ یعنی اس کتاب کا ہم رکھنے میں جو نشانہ الہی کار فرما تھا اس کی واقعیت کا نظارہ آج دنیا کا ہر شخص اپنی آنکھوں سے خود کر سکتا ہے۔ معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار کا جو رنگ ہمیں قرآن کے نام میں دکھائی دیتا ہے۔ وہی رنگ باری تعالیٰ نے صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو عطا کیا ہے۔

قرآن کی طرح لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی معنوی کثرت اور مبالغہ و تکرار پایا جاتا ہے۔ ائمہ لغت و ادب نے لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے :

مُحَمَّدٌ الَّذِي كَثُرَتْ خِصَالُهُ
المحمودة (المفردات، محیط المحيط)
او صاف حمید بے شمار ہوں

اسی طرح کہا گیا ہے۔

وَمِنْهُ مُحَمَّدٌ كَانَتْ حُجْدًا مَرَّةً بَعْدَ
مَرَّةٍ قَلَّتْ إِلَيْهِ مَالًا نَهَايَةَ لَهَا،
اور حمد سے ہی لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نکلا ہے، کیونکہ آپ کی
بار بار اتنی کثرت سے تعریف کی گئی ہے کہ جس کی کوئی
حد ہی نہیں۔ (المطہری، ۲۰: ۱۳۷)

اہم نبوی لکھتے ہیں۔

مُحَمَّدٌ هُوَ الْمُسْتَعْرَفُ لِجَمِيعٍ لِلْحَامِدِ
اور محمد و تعریفات سے معمور ہے

سیدنا حسان بن ثابتؓ نے لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا خوب شرح کی ہے۔

هـ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَرْسَلَ عَبْدَهُ
وَشَقَّهٖ مِنْ إِسْمِهِ لِيَجْلَهُ
بِسْمِ هَانِهِ وَاللَّهُ أَعْلَىٰ وَأَمَجِدُ
فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُودٌ وَهَذَا مُحَمَّدٌ

دیکھا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندے کو اپنی کامل ترین دلیل کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ حالانکہ وہ خود سب سے برتر و برگزیدہ ہے۔ اور اس نے اپنے بندے کا نام اپنے مقدس نام میں سے نکالا تاکہ وہ بھی پیر

تعریف ہو سکے پس عرش والا، خود محمود ہے اور یہ محمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

لفظ قرآن اور لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معنوی جائزہ اس امر کی واضح نشاندہی کر رہا ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن

دونوں کا تذکرہ ابدالاً بادتک کائنات میں جاری و ساری ہے گا۔ یہ دونوں نام اور ذکر باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں لفظی اور معنوی مماثلت جہاں اپنی جگہ ایک زندہ اور دائمی معجزے کا درجہ رکھتی ہے وہاں خود اپنی صداقت و حقانیت پر معروفی شہادت بھی پیش کر رہی ہے کیونکہ کائنات ہست بود میں نہ قرآن سے بڑھ کر کسی کتاب کا پڑھا جانا بہت ہے اور نہ حضرت محمد ﷺ سے بڑھ کر کسی انسان کا چرچا اور تذکرہ ثابت ہے۔

قرآن کا قرأت سے یہ تعلق اس پہلو سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ باری تعالیٰ نے سب سے پہلی قرآنی وحی حکم قرأت کی صورت میں نازل فرمائی۔ یہاں ایک اور امر نہایت غور طلب ہے کہ قرأت کا مادہ بھی حقیقت میں قرار ہے۔ اور علامہ زکشیؒ اس ضمن میں بعض متاخرین کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

انما مادته قرأً بمعنی اظہر و باین، اس کا مادہ (قرآن) ہے جس کا معنی ظاہر کرنا اور اجاگر کرنا ہے۔

والقاری یظہر القرآن ویخرجہ۔ قاری کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ قرآنی آیات کو منہ سے نکالتا اور ظاہر کرتا ہے۔

(البرهان، ۱: ۲۷۷)

اسی طرح وقت کو بھی قرآن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حقیقت (REALITY) ہے جو ظاہر ہونے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کا ظاہر ہونا ایک امر لابدی ہے جسے مخفی رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ گویا وقت اپنے وجود پر خود دلیل ہوتا ہے۔ اسے اپنے ثبوت کے لیے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے قرآن کا یہ معنی ہوا کہ وہ کتاب جو اپنی صحت اور حقانیت پر خود دلیل ہو، چنانچہ قرآن اپنی ذات میں اس قدر واضح، غیر مبہم، ظاہر، روشن اور بہن ہے کہ اسے اپنے دعوے کی صحت و حقانیت پر کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں۔ یہ خود اپنے دعوے پر دلیل قاطع ہے اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الآراء تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ الرَّاء۔ یہ روشن اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں

(یسف: ۱)

سورۃ نسا میں اس تصور کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا (النسا: ۱۷۴) اور ہم نے آپ کی طرف واضح نور بھیجا۔

نور خود روشنی کو کہتے ہیں لیکن اسے ”پھر مبین“ یعنی واضح اور روشن قرار دینے کا مقصد اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ قرآن ایسا نور ہے جسے اپنے ثبوت پر کسی معیار و دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ یہ از خود دعوے بھی ہے اور دلیل بھی۔ یہی مفہوم لفظ ”القرآن“ کے چوتھے ماخذ سے بھی مستفاد ہے۔

ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء الکوفی جو معروف ائمہ نحو میں سے ہیں، کے لفظ قرآن کا چوتھا ماخذ ”القرآن“

مطابق لفظ قرآن غیر مہموز ہے اور القرائن سے مشتق ہے۔ علامہ قرطبیؒ اسی قول کی تائید کرتے ہیں۔ علامہ واحدی بیان کرتے ہیں کہ ابن کثیر قرآن کا لفظ بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے۔ اسی طرح امام بیہقیؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بھی قرآن کو غیر مہموز پڑھتے تھے۔

القرآن قرینہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی علامت، نشان اور دلیل کے ہیں۔ چنانچہ اس مقدس کتاب کو قرآن

اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری آیت کے مدعا و مفہوم کی صحت کا قرینہ ہے۔ گویا قرآن اپنے ہر دعوے کی صداقت و حقیقت کی دلیل بھی خود ہی فراہم کرتا ہے اسے اپنے بیان کی تصدیق کے لیے بنیادی طور پر خارجی قرآن کی احتیاج نہیں ہوتی۔ یہ اعجاز صرف قرآن مجید کا ہے کہ یہ خود ہی اپنے دعوے کی دلیل ہے۔ ورنہ دیگر کتب و صحائف سماوی کی صداقت کا اظہار انبیاء علیہم السلام کے حسی معجزات کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ نبی آخر الزماں ﷺ اور ان پر نازل ہونے والی ابدی کتاب دونوں کا یہ منفرد اعجاز ہے جو کسی اور کتاب اور صاحب کتاب کو حاصل نہیں ہو سکا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام دعوائے نبوت کرتے تو ان کے دعویٰ کی دلیل ان کے حسی معجزات ہوتے جو انہیں صحت نبوت کے قرینہ کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ اسی طرح ان پر جو وحی کی جاتی اس کا احقاق بھی ارباب و معجزات کے ذریعے منصفہ شہود پر آتا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو منجملہ دیگر خصائص امتیازات کے یہ اعجاز بھی عطا کیا گیا کہ آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات خود ہی اپنے دعوائے نبوت کی دلیل تم قرار پائی اور آپ کی کتاب کا ایک ایک لفظ بھی خود اپنے دعوے کی دلیل ٹھہرایا گیا۔

چنانچہ کتاب اور صاحب کتاب ﷺ دونوں اپنی اپنی جگہ ایسے مکمل ام معجزے بنا دیئے گئے کہ انہیں اپنے مدعا کی صداقت و حقیقت کے لیے اصلاً کسی اور معجزے کی حاجت ہی نہ رہی۔ اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ
مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا
مُبِينًا۔ (النساء: ۱۷۴)

اے بنی آدم بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سب سے زیادہ مضبوط اور اٹل دلیل آگئی اور ہم نے تمہاری طرف روشن نور نازل فرمایا۔

برہان سے مراد آل حضرت ﷺ کی ذات گرامی ہے اور نور مبین سے مراد قرآن حکیم۔ اہم راغب اصفہانی ابرہان کا معنی اس طرح بیان کرتے ہیں:

البرهان اكد الأدلة وهو الذي
يقضى الصدق ابداً (الفرات: ۲۵) سچائی پر ہی دلالت کرتی ہے۔

برہان ایسی حتمی شہادت اور قطعی دلیل (FINAL & CONCLUSIVE EVIDENCE) ہوتی ہے کہ اس کے آجانے کے بعد کسی قسم کے عذر و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ابرہان کا معنی درج ذیل الفاظ میں بھی کیا گیا ہے۔
الدليل القاطع للعند والحجة المزیلة (البرہان سے مراد ہر عذر کو حتم کرنے والی دلیل اور تمام شہادت للشبهہ۔ زائل کرنے والی حجت ہے۔

اہم خالان اپنی تفسیر لباب التأویل فی معانی التنزیل میں فرماتے ہیں:

البرهان دلیل علی اقامة الحق والبطال
الباطل والنبي كان كذلك لانه تعالى
جعل حجة قاطعة قطع به عذر
البرهان دلیل علی اقامة الحق والبطال اور نبی اکرم ﷺ اسی شان کے مالک تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی حجت قاطعہ بنایا تھا جس سے تمام

جميع الخلاق - (الحازن: ۱۰، ۴۵۶) مخلوقات کے عذر حتم کر دیے گئے۔

اسی لیے جب رسول عظیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید و رسالت کا اعلان فرمایا تو دنیائے کفر کے سامنے دعویٰ توحید اور اعلان رسالت کی صداقت کے اثبات میں آپ نے جو سب سے پہلی اور آخری دلیل پیش کی وہ خود آپ کی ذات گرامی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس: ۱۴) میں نے تمہارے درمیان ایک عمر گزاری ہے (یعنی زندگی کے چالیس برس) آپس تم غور کیوں نہیں کرتے۔

چنانچہ حضور علیہ السلام نے اپنی نبوت رسالت کا دعویٰ سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کی دلیل کے ساتھ عالم انسانیت کے سامنے پیش کیا۔ روزِ اوّل سے آج تک نہ وہ بے مثال دلیل رد ہو سکی اور نہ اس دعوے کا ابطال ہو سکا۔

یہی انفرادیت اس پیغمبرِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کو بھی حاصل ہوئی کہ یہ خود اپنے دعوے کی ایسی دلیل تھی جسے تاریخ عالم میں ہزاروں سازشوں اور تنقیدی کاوشوں کے باوجود رد نہیں کیا جاسکا۔ گویا کتاب اور صاحب کتاب دونوں اتحاد و عوے و دلیل کے ایسے شاندار مظہر ہیں کہ ان کی نظیر عالم امکان میں ناپید ہے۔

قرآن اپنی نسبت میں پہلوؤں پر مشتمل دعویٰ کرتا ہے۔
قرآنی دعویٰ کیا ہے؟ ایک یہ کہ یہ کتاب کسی فرد کی تصنیف نہیں بلکہ خود خلاق عالم کی نازل کردہ ہے۔ اس کے الفاظ اور معانی سب کچھ الہامی اور منزل من اللہ ہیں۔

دوسرے یہ کتاب اور اس کے جملہ مشمولات حق ہیں جو کچھ اس سے متصاوم ہو وہ باطل ہے۔ تیسرے اس کتاب کی اطاعت دنیا و آخرت کی فوز و فلاح کی ضامن ہے اور اس کے آفاقی اصولوں سے انحراف تباہی و ہلاکت کا باعث ہے۔

(۱) اپنے دعوے کے پہلے حصے کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:

وَإِنَّا لَنَنْزِيلُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (الشوریٰ: ۱۹۲) اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا نازل کردہ ہے سورۃ السجدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَنَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَأُرِيَنَّكُمْ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (السجدہ: ۲) یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربّانی ہے۔
 وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (الشوریٰ: ۷) اور اے محبوب اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی کی ہے۔

سورۃ یوسف میں مذکور ہے:

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (سورہ بقرہ: ۲)

بیشک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

سورہ اشعرار میں یہی امر مزید صراحت کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ (اشعرار: ۱۹۳-۱۹۵)

اس قرآن کو روح الامین (جبرئیل) لے کر اترے آپ کے دل پر تاکہ آپ ڈر سنانے والوں میں ہوں۔ یہ قرآن روشن عربی زبان میں اتارا گیا۔

اگر نزول قرآن صرف معانی کی صوت میں ہوتا تو وحی کو ”عربیت“ سے موصوف نہ کیا جاتا۔ وحی قرآنی کو عربی زبان میں نازل کیے جانے کا بیان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کلام نفسی اور کلام لفظی دونوں کا نام ہے کیونکہ عربیت کلام کے معنی و مفہوم کی نہیں بلکہ الفاظ کی صفت ہے۔

اس دعوے میں شرف و امتیاز کا پہلو یہ ہے کہ سابقہ الہامی کتب اور آسمانی صحائف اکثر معانی و مطالب کی صورت میں نازل کیے گئے ان کے الفاظ منزل من اللہ نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے الفاظ محفوظ نہ رہ سکے اور وہ مور زمانہ کے ساتھ ساتھ حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کا شکار ہو گئے۔ لیکن قرآن اپنی صوت و معنویت دونوں کے اعتبار سے الہامی تھا۔ کسی مخلوق کا فرمودہ یا مصنفہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ آج تک محفوظ رہا اور ابلا بباد تک محفوظ رہے گا۔

(۲) قرآنی دعوے کا دوسرا حصہ اس طرح مذکور ہے:

آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (نحمدہ: ۲)

جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا وہ اس پر ایمان لائے یہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

اس بیان میں صہر ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ حق صرف یہی ہے اور جو کچھ اس سے مختلف یا متضاد ہو وہ باطل ہے

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

إِنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۱۵)

بے شک یہ قرآن تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔

یہاں یہ پہلو بڑی صراحت کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کی پیروی حق ہے اور اس کے ماسویٰ کی باطل۔ یہ امر بھی ذہن نشین ہے کہ انبیاء و صلحاء کی پیروی قرآن ہی کی پیروی ہے اسے ماسویٰ کے زمرے میں تصور نہیں کیا جاتا۔ اس کی وضاحت ہدایت قرآنی کے موضوع کے آخری حصے میں آچکی ہے۔ یہاں باطل سے مراد محض اس شے کی پیروی ہے جس سے قرآن کا انکار و انحراف لازم آئے۔

(۳) قرآنی دعوے کا تیسرا حصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ (الاسراء: ۹)

بیشک یہ قرآن کامیابی و کامرانی کی مضبوط منزل تک پہنچاتا ہے اور اہل ایمان کو خوش خبری دیتا ہے۔

کر یا قرآن نے اپنی اطاعت کے ذریعے دنیا و آخرت کی تمام کامیابیوں کو پالینے کی ضمانت بھی عطا کی ہے۔

یہ تھا قرآنی دعویٰ جو اس نے اپنے منزل بن اللہ حق و صداقت پر مبنی اور فوز و صلاح کا ضامن ہونے کی نسبت بار بار کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قرآنی دعویٰ کی صحت و حقانیت کی دلیل کیا ہے؟

ہر چند کہ قرآنی دعاوی کی صداقت و حقانیت پر دلالت کرنے والی لاکھوں شہادتیں عالم سے مزیں ہیں لیکن جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن خود اپنے دعویٰ کی صحت پر قطعی دلیل ہے۔ اس لیے ہم خارجی شہادات سے صرف نظر کرتے ہوئے خود قرآن کے داخلی قرائن پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تاکہ اسی کے دامن سے اس کے دعویٰ کی تصدیق میسر آئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ فِي ذَالِكَ لَرَحْمَةً وَ
ذِكْرَى لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ
(العنکبوت: ۵۱)

قرآنی دعاوی و احکام کی صحت پر دلیل طلب کرنے والوں کے لیے کیا یہی کافی نہیں کہ ہم نے جو کتاب آپ کے نازل کی ہے اور جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے بیشک اسی میں ایمان والوں کے لیے رحمت اور تنبیہ و عبرت موجود ہے۔

اگر اس آیت کے بیان پر غور فرمائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن خود کو نقادان عالم اور معتزضین اسلام کے سامنے بطور چیلنج پیش کر رہا ہے اور پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے کہ پیغمبر محمدی سے انحراف کر نیوالو! اگر وہی الہی کی صداقت و حقانیت پر تمہیں کوئی حتمی دلیل اور شہادت مطلوب ہو تو آؤ یہ قرآن خود ہی دلیل ہے۔ مختلف زاویہ نئے نگاہ سے اس صحیفہ ہدایت کا جائزہ لو اور دیکھو! کیا اس دلیل کا کوئی پہلو ایسا بھی ہے جس پر انگشت اعتراض بلند کی جاسکے؟ کیا اس کی عظمت و کمال اور حسن و جمال کا کوئی گوشہ عیب دار بھی ہے؟ اگر یہ دلیل ہر نقص سے منزہ و مبرا ہے اور اس کی حتمیت قطعیت ہر لحاظ سے غیر مشکوک ہے تو پھر اس کے ہر دعویٰ کی صحت اور صداقت پر ایمان لے آؤ۔

قرآن چونکہ قیامت تک کے ہر دور کے لیے صحیفہ ہدایت بنایا گیا ہے۔ اس لیے اس کی دلالت بھی زمانی اور مکانی حدود سے بالاتر رکھی گئی ہے۔ قرآن نے اپنی حقانیت پر ایسے دلائل قائم کیے ہیں جو ہر طبقہ کے انسانوں کے حسب حال ہیں۔ مختلف انسانوں کا ذہنی فرق و امتیاز ان کے عقل و فہم کا قدرتی تفاوت اور اس کے مقتضیات ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی مسلمت میں سے ہے کہ انسانی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جب تک وہ اپنی سمجھ اور ذہنی استعداد کے مطابق دلیل نہ پائے۔ دعویٰ تسلیم نہیں کرتی، بنا بریں قرآن کریم میں ان سب دلائل کو جمع کر دیا گیا ہے جسکی کسی بھی انسان کو قیامت تک کبھی ضرورت ہو سکتی تھی۔ پھر لطف یہ ہے کہ مختلف دلائل کا انکشاف تمام خواص کے علاوہ ہر دور کے عامۃ الناس پر اپنے اپنے وقت پر حسب ضرورت ہوتا رہا ہے۔

قرآن نے اپنے دعویٰ پر مختلف انواع و اقسام کے
دلائل قائم کیے ہیں جو اس کی صداقت و حقانیت کے قرآن ہیں۔

قرآنی صداقت کے داخلی قرآن

انہیں فنی اصطلاح میں ”وجہ اعجاز القرآن“ بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ علم شئیت ۲۔ حفاظت اور رکائیت و تاملت ۳۔ علم اختلاف و تناقض ۴۔ قدرت اسلوب نظم کلام ۵۔ فصاحت بلاغت
۶۔ صوتی ترجم و معنی ۷۔ احوال غیب کا بیان ۸۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت ۹۔ اُمیت صاحب قرآن ﷺ
اس موضوع پر جاحظ، جرجانی، واسطی، خطابی، رمانی، رازی، ابن سراقہ، باقلانی، اور ابن العربی وغیرہم نے بڑی
وضاحت سے لکھا ہے۔ امام سیوطی نے الاتقان، ابن حزم نے الفصل فی الملل والنحل، زرکشی نے البرہان، شاہ
ولی اللہ دہلوی نے الفوز الکبیر اور زرقاتی نے منال العرفان میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔ دور جدید کے مصنفین میں
سے سید رضا، سید قلب اور مصطفیٰ صادق الرافعی وغیرہم نے اس موضوع کے بعض گوشوں پر فنی گفتگو کی ہے
لیکن حقیقت یہ ہے تمام ائمہ و علماء کی توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو نمایاں کرتی
رہی ہیں۔ ان وجوہ کا تعدد باہمی تعارض کا باعث نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی حسن جمال کا پیکر اتم اگر چند
مختلف الذوق لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے تو ہر شخص دادِ نظارہ دیتے ہوئے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس
حسن کے وجوہ اعجاز پر روشنی ڈالے گا۔ کوئی تناسبِ اعضاء پر فریفتہ ہوگا۔ کسی کو رنگ و زینت پر شیفنگی ہوگی
کوئی قد و قامت کی موزونیت پر نثار ہوگا۔ کوئی گیسوئے عنبریں کا اسیر ہوگا، کوئی چشمِ نرگسی میں ڈوب رہا ہوگا اور کوئی
جمالِ آفتیش کی فسوں کاریوں سے متاثر ہوگا۔ الغرض جب سن کامل اور جمال تم ہوگا تو اس کی ہر ادا و مشاقان دید کو دعوت
نظارہ دے گی اور اہل نظر کو ہر ہر قدم پر ”جائیں جاست“ کا سماں نظر آئے گا اور وہ دیں جو حیرت ہو جائیں گے۔ شاہ ولی اللہ
محدث دہلوی قرآن کے اسی اعجازِ حسن کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

زفرق تاقدش ہر کجا کہ می محرم
مگر شمر دامن دل می کشد کہ جائیں جاست
تعبیرات تشریحات اگرچہ مختلف ہوں انداز ہائے بیاب بھی بیشک بدلے ہوئے ہوں لیکن یہ سب اسی ایک
حسن تمام کی جلوہ پاشیاں ہی ہیں۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد و کل الی ذاک الجمال یشین

قرآن نے اپنے دعویٰ کی صحت و حقانیت کی دلیل اپنی عام شئیت کو قرار دیا ہے اور علم انسانی جان
کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس کلام کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے کی دلیل یہ ہے

علم شئیت

کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل لانے سے قاصر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔
قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ
یَاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ
بِمِثْلِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنْ لَدُنْہٗ لَبِیْضٌ ظٰہِرٌ
لے محبوب تو فرما دے کہ اگر تمام انسان اور جن
اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی
وہ اس کا مثل نہیں لاسکتے۔ اگرچہ وہ ایک
دوسرے کے مددگار ہی بن جائیں۔

(بنی اسرائیل: ۲۸۸)

دوسرے مقام پر مخالفین کو فرمایا گیا کہ پورے قرآن کا مثل لانا تو دہندہ قرآن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افسوسناک پڑا ہی کرنے والے اپنے قول کی تائید میں صرف دس سورتوں کی ہی مثل لے آئیں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوْرٍ كَمَا وَدَّ اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَهُمْ بَأْسٌ فَاتَّخَذُوا لِقَاءِ اللَّهِ حِجَابًا مُّشْتَرِكًا
مِثْلَهُ مُفْتَرٍ لَيْتَ
(ہود: ۱۳)

گھڑ لیا ہے تو کہہ دے کہ اچھا تم اس طرح کی گھڑی ہوئی
دس سورتیں ہی لے آؤ۔

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا۔
إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ
(البقرہ: ۲۳)

اگر تمہیں کوئی شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے
پر نازل کیا تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی لے آؤ اور
اللہ کے سوا اپنے تمام حمایتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

اس کے بعد ابالاباد تک کے لیے اس امر میں پورے عالم کفر کی ناکامی کا بیان کیا گیا ہے۔ جس کی شہادت
چودہ سو سال کی تاریخ دے رہی ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا لَنْ تَفْعَلُوا فَأْتُوا لِنِجَارِ
الَّتِي وَقَعَتْ هَٰلِكَ النَّاسُ وَلِحِجَارَةِ
أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ: ۲۴)

پھر اگر تم قرآن کی ایک سورت کی مثل بھی نہ لاسکو اور تم
ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی
اور پتھر ہیں جو تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ عالم یہودیت اور عالم عیسائیت اسلام کے خلاف
کس حد تک برسر پیکار رہے ہیں۔ تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے اور آج بھی اسلامی تعلیمات
کو مسخ کرنے کی کتنی کوششیں مغربی و مشرقی اساطین کے ذریعے دنیا میں ہو رہی ہیں۔ اہل بصیرت سے مخفی نہیں لیکن ان بھرپور
مخاصمانہ کاوشوں کے باوجود آج تک قرآن کی کسی ایک سورت یا آیت کی مثل نہیں بنائی جاسکی۔ اگر اس کے الہامی ہونے کا
دعوئی غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرض وجود میں آچکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عیسایہ اسلام کے بعد علم عیسائیت
میں انجیل کے ۱۳۳ نسخے رواج پاچکے تھے۔ جن میں سے بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سندِ صحت عطا کر دی گئی۔
آج بھی انجیل یوحنا، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں اور پوری دنیائے
عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اسلام کے خلاف اندرونی اور بیرونی سطح پر لاکھوں
سازشیں ہوئیں۔ لیکن قرآن کا عدم مثلیت کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی تقریباً ایک ارب افراد پر مشتمل
ملتِ اسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ بلکہ صفحہ ہستی پر آج تک
قرآن کا کوئی تبادلہ نسخہ پیش نہیں کیا جاسکا۔ بعض جھوٹے مدعیان نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی
لیکن ہمیشہ خامر و خائب ہوئے اسی طرح اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمت اعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اقدام کیا تو وہ بھی
ناکام و نامراد ہی رہا۔

ابن جوزیؒ نے وفانی فضائل مصطفیٰ میں امام ابن عقیل کے حوالے سے ابو محمد بن مسلم نخوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ عجاز القرآن پر گفتگو کر رہے تھے وہاں ایک فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اُس نے کہا کہ قرآن میں ایسی کون سی ندرت کمال ہے جس سے فضلاء بلغا عاجز آجائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالاخانے پر چڑھ گیا اور وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآن مجید کی مثل کچھ لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور وہ نیچے نہ اُترتا تو ایک شخص بالاخانے پر چڑھا تو نے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔ ایسے واقعات ”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا دَلْتُمْ نَفْسَكُمْ“ (پھر اگر تم ایسا نہ کرو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے) کی زندہ شہادتیں ہیں۔

۲- حفاظت اور کالیٹ تمامیت کا وعدہ بھی خود ہی فرمایا ہے۔
قرآنی حقیقت کا دوسرا قرینہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۹)

بیشک یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

چنانچہ وعدہ الہی کے مطابق قرآن آج تک ہر قسم کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا ہے۔ اس لیے یہ کمال بھی ہے تمام بھی۔ عہد رسالت میں جب قرآنی آیات متعدد اشیاء پر معرض تحریر میں لائی جاتی تھیں اور مکمل طور پر محرزہ اور مرتب شدہ کوئی جلد موجود نہ تھی۔ اس دور میں بھی پورا قرآن تحریری طور پر موجود و محفوظ تھا اور خود نبی اکرم کے علاوہ کئی صحابہ بھی قرآن کے حافظ تھے۔ لیکن باقاعدہ طور پر عہد صدیقی میں مصحف کے نام سے ایک جامع نسخہ قرآن مرتب کیا گیا۔ جسے سورتوں کی طوالت و قصارت کے اعتبار سے سبع طوال، مبین، ثمانی اور مفصل میں تقسیم کر دیا گیا، لیکن سورتوں کی ترتیب وہی رہی جو خود رسول اکرم ﷺ نے بذریعہ وحی مقرر فرمادی تھی۔ چنانچہ عہد عثمانی میں پھر تمام صحابہ اہل بیت اور حفاظ کرام کے مکمل اتفاق سے سرکاری طور پر ایک نسخہ تیار کیا گیا جو مصحف عثمانی کے نام سے معروف ہوا۔

قرآن کی جمع و تدوین کا یہ کام جو سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پایہ انجام تک پہنچا۔ دراصل خود اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی حفاظت میں ہوا۔ کیونکہ ارشادِ ربّانی ہے۔

إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (القیامۃ: ۱۷)

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

اس پہلو کا مطالعہ بیعت رضوان کے حوالے سے نہایت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تدوین کا آخری کام متعدد صحابہ و خلفاء کے باوجود حضرت عثمان غنیؓ سے کیوں لیا؟ اس کی وضاحت صلح حدیبیہ کے واقعے سے ہوتی ہے جب آنحضرت ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ہمراہ ہنقاہ حدیبیہ پڑاؤ کیا اور عثمان غنیؓ کو اہل مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ کفار و مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں اندریں صورت نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہ کرام سے جہاد پر آمادگی کی بیعت لی۔ جسے ”بیعت رضوان“ کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر قرآن میں یوں آتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ بَيَأُيَعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ

آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے الٰہی کے ہاتھ پر

يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ

(الفتح، ۲۸: ۱۰۰)

بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے دستِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا۔ جب تمام صحابہ کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

(اے اللہ! عثمان تیرے اور تیرے رسول کے کام گیا ہوا ہے۔ پس آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہی ہاتھ کو عثمان کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے ان کی طرف بیعت لی۔ پس حضرت عثمانؓ نے لیے حضور کا ہاتھ دیگر تمام صحابہ کے لیے ان کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔

ان عثمان في حاجة الله قلل و
حاجة رسولہ۔ فضرب باحدى يديه
على الاخرى فكانت يده رسول الله
صله الله عليه وسلو لعثمان رضی الله عنه
خيراً من ايديهم لانفسهم۔

(ترمذی، ۲۷: ۲۱۱)

ابن ہشام لکھتے ہیں:-

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت لے لی۔

بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم
لعثمان رضی الله عنه فضرب باحدى
يديه على الاخرى۔ (تفسیر ابن کثیر، ۳: ۱۸۶-۱۸۷)

اب یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ ادھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا جبکہ دوسری طرف ”يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ“ کے مطابق حضور علیہ السلام کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا۔ گویا بالواسطہ عثمانؓ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ حفاظت قرار دیا۔ لہذا اس ہاتھ سے جمع و تدوینِ قرآن کے کام کا انجام پانا وعدہ الہی اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ”قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے“ کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے ہی انجام پانا ہے۔

یہ اسی حفاظتِ الہیہ کا کرشمہ ہے کہ ۱۴۰۰ سال گزر جانے کے باوجود آج تک قرآن میں ایک آیت یا ایک لفظ اور حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلامِ مجید کے نسخے موجود محفوظ ہیں۔ لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر و زبر تک کا فرق نظر نہیں آتا۔ قرآنی حقانیت کا اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے۔

باری تعالیٰ نے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں) کے الفاظ کی صورت میں وعدہ حفاظتِ قرآن کے سوا کسی اور الہامی کتاب یا صحیفے کے حق میں نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل (BIBLE) کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ رد و بدل، حذف و اضافہ اور تحریف و ترمیم کی تاریخ ہے۔ دوسری صدی عیسوی سے لیکر

سترھویں صدی عیسوی تک عہد نامہ جدید (NEW TESTAMENT) میں کئی حصوں کو پارہوں کے

حسب نسا اور مختلف کونسلوں (COUNCILS) کے فیصلوں کے مطابق کبھی ذہل کیا جاتا رہا اور کبھی نکالا جاتا رہا۔ برنباؤس اور کئی اور کتابیں جن کا مجموعہ ۱۶۶۲ء میں اپوسٹالک فادرز (APOSTOLIC FATHERS) کے نام سے شائع ہوا تھا، ایسی تھیں جنہیں عیسائیت کے اوائل دور میں نہایت مقبولیت حاصل رہی لیکن بعد میں نہیں بائبل میں سے محض اس لیے خارج کر دیا گیا کہ ان کی تعلیمات سینٹ پال کی نحو ساختہ عیسائیت کے باطل عقائد کے خلاف تھیں۔ اسی طرح اپوکریفا (APOCRYPHA) اس عیسائی لٹریچر کا مجموعہ ہے جسے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی مفادات کے خلاف تصور کرتے ہوئے چھپا دیا۔ لیکن ان کا وجود دنیا سے اب تک ختم نہیں ہو سکا۔ سب سے پہلی مکمل بائبل گوٹن برگ (GUTENBURG) کے مطبع سے ۱۴۵۵ء میں ولگیٹ (VULGATE) کے نام سے چھپی جس کے خلاف ۱۶ ویں صدی کے اوائل میں پھر پروٹیسٹنٹ اصلاحی تحریک کے ساتھ اعتراضات و تنقیدات کا دروازہ کھل گیا۔ الغرض ۱۵۴۶ء میں COUNCIL OF TRENT کے ذریعے اسے حتمی شکل دی گئی اور بالآخر رومن چرچ نے اسے بائبل کے مستند نسخے کے طور پر اپنالیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں پھر ردو بدل کی ضرورت محسوس کی گئی اور POPE SIXTUS V نے ضروری ترمیمات و تصحیحات کے ذریعے یونیورسٹی آف پیرس کے قن کی صورت میں ۱۵۹۰ء میں شائع کیا۔ یہ مختصر تاریخی خاکہ مثیلاً اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے تناظر میں قرآن کی حفاظت اور کاملیت و تمامیت کا جائزہ لیا جاسکے کہ دوسری الہامی کتابوں کے ارتقائی احوال کیا ہیں اور وہ کس طرح ہمیشہ ناقص و نامم رہی ہیں اور ان کے برعکس قرآن کا عالم کیا ہے کہ وہ ابتدائی دور سے لیکر آج تک اپنی متن اور عبارت کے لحاظ سے کامل و مکمل رہا ہے۔ اس میں آج تک نہ کسی لفظ یا آیت کی کمی کی گئی اور نہ کسی شے کا اضافہ۔ یہ جس حالت میں پیغمبر اسلام ﷺ نے امت کو عطا کیا تھا۔ آج تک اسی حالت میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے محفوظ ہے۔

۳۔ عدم اختلاف و تناقض | قرآن اپنے اعجاز پر ایک دلیل یہ بھی پیش کرتا ہے کہ وہ اختلاف و تناقض سے مبرا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَوْ كَانَتْ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ
اِخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (النساء: ۸۲)

مہم مصنفین کی تالیفات قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی نظر ڈالیے تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق بھی ممکن نہ ہوگی۔ مضامین کا اختلاف، ناموں اور نسلوں کا اختلاف، واقعات کا اختلاف لشکر کی تعداد کا اختلاف، بیانات کا اختلاف، سینیں و اوقات کا اختلاف، الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات اور تناقضات ہیں جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیروکار نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسی کتابوں کو موضوع یا محرف ماننے کو تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے آسانی ہو سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا امریکانا (ENCYCLO PAEDIA AMERICANA) میں بائبل (BIBLE)

کے مضمون کے تحت اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں کم و بیش تیس ہزار اغلاط

موجود ہیں۔ اسی طرح | FRED GLAD STONE BRATTON نے HISTORY OF

BIBLE مطبوعہ بوٹن U.S.A. صفحہ ۵ پر اس حقیقت کو بصراحت تسلیم کر لیا ہے کہ بائبل کے اندر واقعاتی اغلاط، غیر سائنسی نظریات، خدا اور انسان کی نسبت ناپاک تصورات، تضادات و تناقضات، نامعقول بیانات مبالغہ آمیزیاں اور ناپختہ خیالات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن اس کے برعکس قرآن اول سے آخر تک ہر قسم کے اختلاف اور تناقض سے پاک ہے بلکہ ہر آیت دوسری کی توفیق اور ہر مقام دوسرے کا مصدق ہے۔

۵ آفتاب آمد دلیل آفتاب محمد لیلیت بایدا زوی رومتاب

قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات متعدد جگہ بیان ہوتا ہے۔ ہر مقام پر انداز بیان اور سیاق و سباق مختلف ہونے کے باوجود اس کی واقعیت میں کوئی خفیف سا اختلاف بھی نظر نہیں آسکتا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہو سکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں کبھی دن کو کبھی رات کو کبھی سفر میں کبھی حضر میں کبھی گھر اور کبھی میدان جنگ میں الغرض ہمیشہ ہنگامی صورت میں اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی نازل ہوتیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول ۲۳ سال تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں حالات کے ہزاروں زیروم آئیں اور قرآن ایک جلد کی صورت میں مرتب بھی نہ ہو رہا ہو۔ بلکہ لوگ اپنے طوطی پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور پڑیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے ہوں۔ اس انداز سے اس کا نزول اور جمع و تدوین عمل میں آئے اور پھر بھی یہ ہر قسم کے اختلاف سے بچسکا ہے تو اس کے منزل من اللہ اور بنی برحق ہونے پر کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔ متزاد یہ کہ اس وقت پریس بھی نہ تھی۔ صرف قلمی نسخوں کے ذریعے قرآن کی اشاعت ہو رہی تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ فلسطین، مصر، شام، عراق، یمن اور ہندوستان تک کے عجمی ممالک میں قلمی نسخے تیار ہوئے اور ہر ایک کے سامنے صرف مصحف عثمانی کا معیار تھا اگر حفاظت الہیہ شامل حال نہ ہوتی تو عمداً یا سہواً عبارات قرآنی میں کئی اختلافات پیدا ہو سکتے تھے۔ جس طرح احادیث کے مملے میں وضع حدیث کا قلم وجود میں آیا یہ فقہ دامن قرآن کو بھی متاثر کر سکتا تھا لیکن یہ اعجاز قرآن تھا کہ آج تک ایسا اختلاف صرف اعراب کی حد تک بھی پیدا نہ ہو سکا۔ حالانکہ اعراب لگانے کا کام بھی عہد رسالت کے بہت بعد میں ہوا۔ اس سے پہلے تمام نسخے بغیر اعراب کے پڑھے جاتے تھے اندر ایسی حالات قرآن حکیم کا ہر قسم کے اختلاف و تناقض سے مبرا ہونا اس کے حق اور منزل من اللہ ہونے کی بین دلیل ہے

۴۔ ندرت اسلوب و نظم کلام | عہد نزول قرآن تک عربوں میں قصائد، مکتوبات، خطبات اور محاورات۔

ان معینہ اور معلومہ اسالیب مختلف ایک نیا اسلوب بیان پیدا کر لینا ایک معجزہ تھا۔

قرآن کی ندرت اسلوب کا یہ عالم ہے کہ یہ انداز آج تک کسی اور ادب میں پیدا نہیں ہو سکا۔ عام کتابیں ابواب و فصول پر منقسم ہوتی ہیں لیکن قرآن ایسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے اور نہ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام میں ایک تسلسل اور روانی ہے کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔

قرآن نے اپنی بعض سورتوں کو حمد و ثنا سے شروع کیا اور بعض کو غرض بیان کی وضاحت سے بعض کا

اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر کبھی وعدہ کا ذکر کیا کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تہذیب کا کبھی تہدید کی کبھی تاکید، کبھی مخلوق کا بیان کیا کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں کبھی قصص واقعات، کبھی حلت حرمت کے احکام دیئے کبھی استثنیٰ اور خصت کے کبھی احقاق حق کیا کبھی ابطال باطل، کہیں مخاصمہ کا دمک اپنایا، کہیں موعظت کا کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں کہیں ان کی عظمتیں اور رفتیں، کہیں خطاب ہے کہیں غیبت اور کہیں تکلم، انداز کلام بغیر تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قرآن کے اسلوب بیان اور نظم کلام کے سلسلے میں مزید دو امور قابل توجہ ہیں۔

۱: انتشار مطالب ب: تکرار مضامین

قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پانچ انواع پر مشتمل ہیں۔ علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بالآثار اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت

۱: قرآنی اسلوب میں انتشار مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم مذکور ہوگا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا، بلکہ ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک علم کے ساتھ متصلاً دوسرا علم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں تو یقیناً مذاق لطیف پر گراں گزرتا ہے لیکن قرآنی اعجاز کا یہ علم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم میں روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے یہاں تک کہ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب روئے سخن بدل گیا ہے بات بغیر بار کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ الضحیٰ کا مطالعہ کیجئے :-

وَالضُّحٰی ۔ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ ۔ وَمَا قَلٰی ۔ وَلَاخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِ ۔ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ۔ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا ۔ فَآوٰی ۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰی ۔ وَوَجَدَكَ عَآیِلًا فَاغْنٰی ۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَاَلْقٰنٰهُ ۔ وَامَّا السَّآئِلَ فَاَلْتَمَدْ ۔ وَامَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔

قسم ہے چاشت کی اور رات کی جب وہ پردہ ڈالے کہ (اے محبوب) تجھے تیرے رب نے نہ چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی وہ تارفل ہے بے شک تمہارے لیے (ہر) پھلی گھڑی پہلی سے بہتر ہے۔ اور بے شک تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے کیا اس نے تمہیں یتیم نہ پایا پھر جبکہ وہی اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی اور تمہیں حاجت مند پایا پھر غنی کر دیا، تو یتیم پر دباؤ نہ ڈال اور سائل کو نہ بھرتک اور اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کر۔

یہاں چاشت اور رات کی قسم کھانی جا رہی ہے پھر حضور ﷺ سے نہ روٹھنے کا بیان ہے پھر آپ کو خوشخبریاں سنائی گئی ہیں، پھر آپ کی یتیمی اور محبت میں وارفتگی کا ذکر ہے۔ پھر حاجت مندی کے دور کا ذکر ہے اس کے بعد یتیموں اور سائلوں سے بھلائی کا حکم ہے اور پھر تحدیثِ نعمت کا حکم ہے۔ ایک چھوٹی سی سورت میں احکام، انعامات اللہ اور سابقہ احوال و واقعات سب کچھ درج کرنا گیا ہے اسی طرح سورۃ یوسف، سورۃ کہف، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ ہود

سورہ یونس اور دیگر سورتوں کا مطالعہ کیجئے آپ کو مطالب کے تنوع اور انتشار میں بھی ایک ہم آہنگی اور اتصال نظر آئے گا۔ یہ خوبی دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں مضامین کے تنوع کے باوجود آیات کے درمیان معنوی ربط برقرار رہتا ہے۔ سورہ الکھثر پر نظر ڈالیے:

إِنَّا عَطَيْنَاكَ الْكُوثُرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ
وَافْحَرْ ۚ إِنَّ شَانِكَ هُوَ الْآخِرُ
اے محبوب! بیشک ہم نے نہیں خیر کثیر عطا کی
پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے
بیشک تمہارا دشمن ہی محروم و نامراد ہے۔

اس مختصر سی سورت کے تین جملے ہیں۔ تینوں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معنی و مطلب بیان کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوستہ معلوم ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے عطا نعمت کا بیان ہے پھر حکم عبادت آخر میں مخالفوں کے لیے چیلنج ہے بلکہ پیشین گوئی بھی ہے گویا انتشار مطالب میں بھی معنوی اتحاد اور تسلسل کی کیفیت نظر آتی ہے۔

ب: تکرار مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بیان کا مقصد صرف ایک حقیقت سے دوسرے کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے پہلے مقصد کے لیے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی رہتا ہے لیکن دوسرے مقصد کے لیے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے ایسے مضامین کے لیے قرآن کے پیش نظر دوسرا مقصد مخاطب تھا۔ چنانچہ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا۔ لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و معنویت کے ساتھ۔ جس طرح ذوق لطیف کا حال شخص یا ایک اچھا شعر بار بار سن کر نئی لذت اور لطف اٹھاتا ہے اسی طرح قرآن میں تکرار مضامین ہر بار نئی لذت اور لطف کا باعث بنتا ہے، اکثر کسی نثر کی کتاب میں ایسا ہو تو طبیعت پر بوجھ بنتا ہے اور عبادت اپنی رنگینی و دلکشی کھو بیٹھتی ہے لیکن قرآن منظوم نہیں نثر ہے اس کے باوجود اس کی بے پایاں لذت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ مثلاً سورہ شعراء میں اِنْفِ ذَالِكْ لَايَةُ ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ اٹھ بار آیا ہے سورہ قمر میں وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدْكِرٍ ۙ چار بار آیا ہے۔ سورہ مرسلات میں وَيَلْوِيْ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَ دَس ۙ اکتیس بار آیا ہے، لیکن ہر جگہ ایک نیا لطف اور منفرد کیفیت نصیب ہوتی ہے بلکہ اس تکرار سے دل و دماغ پر اکٹا ہٹ کے بجائے ہر بار نئے معانی و غوامض اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

علامہ بدین جماعہ نے اسی موضوع پر "المقتضی فی فوائد تکرار المقصص" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے جس کا معارضہ آج تک بڑے بڑے فصحاء و بلغاء نہیں کر سکے۔ اس میں

۵۔ فصاحت و بلاغت

مقتضائے حال کی رعایت، استعارہ و کنایہ کا استعمال اور صنائع و بدائع کا وجود ناقابل بیان حسن اور ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ علامہ کرمانی اپنی کتاب "الجمائب" میں لکھتے ہیں کہ معاذین نے عربی علم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے مگر کوئی کلام بھی حسن نظم اور معنی، فصاحت و بلاغت اور ایجاز میں اس کی مثل نہ پایا اور بالآخر اس امر پر متفق ہو گئے کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی

مثال لانے سے قاصر ہے قرآن کی فصاحت و بلاغت کا یہ اعجاز تھا کہ دنیا کے عرب کے ادبی شاہکار " سبع معلقات " جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے نزول قرآن کے بعد اتار لیے گئے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کونئی شے بھی معارضہ نہیں کر سکتی۔

فصاحت قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

مجاز و کنایہ:

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں آؤ جیسے

(۱) نِسَاءَكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاتُوا حَرْثَكُمْ

چاہو

أَفِي شِعْتُمْ (البقرہ، ۲: ۲۲۳)

عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

(۲) هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ

لَهُنَّ (البقرہ، ۲: ۱۸۲)

یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو

(۳) أَوْلَاكُمْ النِّسَاءُ (النساء، ۴: ۴۳)

جب وہ (آدم) اس (حوار) کے پاس گئے تو اس نے

(۴) فَلَمَّا تَنَسَّاهَا حَلَّتْ حَمْلًا خَفِيًّا

ہلکا سا بوجھ اٹھا لیا۔ (یعنی وہ امید سے ہو گئیں)

(الاعراف، ۷: ۱۸۹)

بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جیسے چاہتا ہے

(۵) بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُوقِفُ كَيْفَ

خرچ کرتا ہے۔

يَشَاءُ (المائدہ، ۵: ۶۴)

مذکورہ بالا آیات میں جس لطافت کے ساتھ مجاز اور کنایہ کے انداز میں ہر بات کہی گئی ہے اس کا اندازہ صاحب

ذوق لطیف ہی کر سکتا ہے۔

ان آیات میں بیان کی بے ساختگی اور اظہار کی بے تکلفی بھی ہے اور کمال درجہ حیا و شرافت کی آئینہ داری بھی۔ اشاروں میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایسے مضامین اور احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بڑے بڑے ادیب اشارت اور صریحاً ایسے خوبصورت امتزاج کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تشبیہ و استعارہ

اس کے نور کی مثال تندیل کی ہے جس میں چراغ ہو

(۱) كَمَثَلِ نُورٍ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ

(النور، ۲۴: ۳۵)

گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں

(۲) كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفًا

(الحجرات، ۱۰: ۵)

یہاں علم سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے والوں کا بیان کس قدر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

قسم ہے رات کی جب پیٹھ دے (یعنی تاریکی

(۳) وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ

ہلکی پڑے) اور صبح کی جب دم لے (یعنی آہستہ آہستہ

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ

نمودار ہو)

(الکوثر، ۸۱: ۱۷-۱۸)

ان دو آیات میں رات کے دھیرے دھیرے جانے اور صبح کے رفتہ رفتہ آنے کا ذکر نہایت دلکش انداز میں ہے۔

چند مزید آیات ملاحظہ ہوں جن کی فصاحت و بلاغت رشکِ ادب ہے۔

(۱) وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَسْمَاءُ
أَقْلَعِي وَغِيضَ الْمَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ
بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے اور آسمان تھم جا
اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہِ جودی پر
ٹھہری اور فرمایا گیا فوراً ہوں بے انصاف
لوگ۔

(ہود، ۱۱۱، ۱۱۲)

ام سیوطی الاتقان میں ابن ابی الاصبغ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے آج تک اس آیت کی مثل نہیں دیکھی۔ اس میں سترہ لفظ ہیں اور بیس بدائع ہیں۔

ابلعی اور اقلعی میں مناسبت تامر ہے، ابلعی اور اقلعی میں استعارہ بھی ہے، ارض و سما میں صفت طباق ہے یسما میں مجاز ہے، غیض الماء میں اشارہ ہے، واستوت میں صفت ادا ہے، قضی الامر میں تمثیل ہے قضی الامر میں تعلیل بھی ہے کیونکہ غیض الماء اس کی علت ہے، اس میں صحت تقسیم بھی ہے، اس میں احتراس فی الدعاء ہے، اس میں حسن نسق ہے اس میں استلاف اللفظ مع المعنی ہے، اس میں ایجاز ہے، اس میں تسہیم ہے کیونکہ آیت کا اول اس کے آخر پر دلالت کرتا ہے، اس میں تہذیب ہے کیونکہ اس کے مفردات میں حسن ہے، ہر لفظ سہل المخرج ہے اور بشارت عقارت سے خالی ہے، اس میں حسن بیان ہے، اس میں تمکین ہے، اس میں انجم ہے، اور اس میں اعتراض بھی ہے کیونکہ یہاں تین جملے معترضہ لائے گئے ہیں۔

اسی طرح ایجاز کی مثال ملاحظہ ہو۔

(۲) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (البقرہ، ۲: ۱۷۹) تمہارے لیے انتقام و قصاص میں زندگی مضمر ہے۔
الاتقان میں مذکور ہے کہ اس آیت میں بھی (۲۰) صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

(۳) اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (البقرہ، ۲: ۲۵۷) اللہ ایمان والوں کا دوست ہے انہیں اندھیروں میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

اس کی فصاحت و بلاغت کے بیان پر ام سیوطی نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں ایک سو بیس بدائع بیان کیے ہیں۔ ام راعب اصفہانی فرماتے ہیں کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں ان کے لیے اعجاز قرآن کی کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں فصاحت و بلاغت قرآنی خود اپنی صداقت و حقانیت پر دلیل قاطع ہے۔ جن لوگوں نے سلامت ذوق اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذہ شعر و سخن کا کلام پڑھا اور اپنے ذوق و وجدان کو پختہ و شائستہ بنالیا انہیں ہی فصاحت قرآن کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احادیث، سیر و مغازی اور تاریخ اسلام کے طلبہ جانتے ہیں کہ عقبہ بن ربیعہ، ایسی غفاری، ولید بن ضماد، عمرو بن جموح

حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، لبید، طفیل بن عمر، زید الجلیل، کعب بن زہیر، شماس اسود بن مرتع وغیرم عرب کے معروف اور نامور سردار، سخن گو اور شعرا قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سرختم تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی نے "فَاَصْدَعُ بِمَا تَوَمَّرُ" کے الفاظ سنے اور سر بسجود ہو گیا۔

اسی طرح قرآن کی یہ آیت فصاحت و بلاغت کا کینا عظیم نمونہ ہے :-

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰی اِمِّ مُوسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ
فَاِذَا اخْفَتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ
وَلَا تَخَافِ وَلَا تَحْزَنِ اِنَّا رَادُّوْهُ
اِلَيْكَ وَجَاعِلُوْهُ مِنْ الْمُرْسَلِيْنَ

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلاؤ
اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں
ڈال دو اور نہ خوف کرو نہ غم پھر ہم موسیٰ کو تمہاری طرف
لوٹا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔

سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو امر کے صیغے اور دونوں کے، دو خبریں اور دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اس کے دعاوی اور اعلانات کی صحت و حقیقت کی ایسی دلیل ہے کہ کوئی بھی سلیم الطبع صاحب فن اسکا انکار نہیں کر سکتا۔

قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔ یہ صوتی ترنم و نغمہ منہاج قرآن کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔ یہ صوتی ترنم و نغمہ منہاج قرآن کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔

۴۔ صوتی ترنم و نغمہ

قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔ یہ صوتی ترنم و نغمہ منہاج قرآن کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔

منہاج قرآن کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔ یہ صوتی ترنم و نغمہ منہاج قرآن کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک نغمہ کا صوتی حسن جمال پایا جاتا ہے۔

۱: ن . وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (ن)

۲: وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا . فَالْعَصْفِ عَصْفًا . وَالنَّشْرِ نَشْرًا . فَالْفِرْقَةِ فِرْقًا .
فَالْمُلْقَاتِ ذِكْرًا . عُدْرًا اَوْ نُذْرًا . (المرسلات)

۳: فَاِذَا النُّجُومُ طُمِئَتْ . وَاِذَا السَّمَاءُ فُرْجَتْ . وَاِذَا الْجِبَالُ سُفَّتْ . وَاِذَا الرَّسُلُ اُقْتَتْ .
لَا يَخِيْفُهَا مِنْ اَجَلَتْ . (المرسلات)

۴: وَاِذَا السَّمَاءُ كُفِّرَتْ . وَابْتُلِيَ الْجَبَلُ مِنْ يَدَيْهِ فَسُطَّتْ . وَاِذَا الْوُجُوهٌ كُنِتِرَتْ .
وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ . وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ . وَاِذَا الْوُجُوهٌ كُنِتِرَتْ . (الناشئ)

۵: وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا . وَالْقَمَرِ اِذَا تَلَّهَا . وَالنَّهَارِ اِذَا جَلَّهَا . وَاللَّيْلِ اِذَا يَشَّهَا .
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا . وَالْاَرْضِ وَمَا طَحَّهَا . وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا . فَالْهَمَّهَا فُجُورَهَا
وَتَقْوَاهَا . قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا . وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا . (الشمس)

۶: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا . وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا . وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا . (الزلزال)

۷: فَأَشْرَنَ بِهِ نَفْعًا . فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا . (الطہ)

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتامی لفظ ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چننا اور وزن۔ ان کا آپس میں جوڑ اور ترکیب، پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں، سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور ہر لمحہ عجیب سی صلاوت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاق سلیم اور حس لطیف ہو تو ان آیات کے تلفظ سے ہی کسی حد تک معنی و مفہوم کی ترجمانی ہوتی نظر آتی ہے۔

۱: مثلاً سورۃ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف "س" کثرت استعمال کے باعث سرگوشی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہی سرگوشی اور وسوسہ اندازی اس سورت کا موضوع ہے۔

۲: اسی طرح سورۃ الملک میں ارشاد ہوتا ہے:-

تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ

کچھ بعید نہیں کہ جہنم غصہ سے پھٹ جائے

یہاں لفظ تَمَيِّزُ میں "ی" پر شد سے جو آواز پیدا ہو رہی ہے اسی سے غیظ و غضب کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

۳: سورۃ الفجر کی ان آیات کو پڑھیے اور ان کے تلفظ پر غور کیجئے۔

إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا

اس میں دُكَّتِ اور دَكًّا دَكًّا کے الفاظ کی تشدیدات سے جو صوتی کیفیت پیدا ہو رہی ہے اسی سے ہی ٹھکانے اور پاش پاش ہونے کا تاثر ابھرتا ہے۔

۴: اسی طرح سورۃ الرحمن میں ملاحظہ فرمائیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقَيْنِ

اس نے دو سمندر بہاتے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوں۔

اس آیت کے تینوں الفاظ میں صوتی بہاؤ اور روانی کا سماں پایا جاتا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے۔

۵: فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتِنِ

ان میں دو چشمے ہیں پھلکتے ہوئے۔

نَضَّاخَتِنِ کا لفظ غور سے پڑھیے اس میں "ض" پر شد سے کسی چیز کے پھٹنے اور پھلکنے کا تاثر ابھرتا ہے

۶: اسی طرح

مُتَكِّئِينَ عَلَى رُفُوفٍ

تکیہ لگائے بچھونوں پر

کے الفاظ میں سکون کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآنی آیات اپنے اندر ایک قدرتی تناسب تو ازن، موزونیت و موسیقیت اور ترنم و نغمہ رکھتی ہیں جس سے خاص قسم کی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت بھی قرآن ہی کا اعجاز ہے ایسا رنگ آج تک کسی اور کلام میں نہیں دیکھا جاسکا۔

۷: احوال غیب کا بیان | قرآن حکیم کی صداقت حقیقت کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں حوال غیبی کا بیان ہے قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے۔

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ
إِلَيْكَ (آل عمران: ۳: ۲۲)

ایک اور قسم پر اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ
مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ
مِنْ قَبْلِ هَذَا (هود: ۱۱: ۲۹)

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمایاں معجزات میں سے تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی علوم غیب کے بیان میں نخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ تسلی بخش جواب دیا کرتا تھا۔ حضور علیہ السلام کے ہمہ جہت علم کے اس گوشے کا ذکر قرآن حکیم لیں کرتا ہے۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب بیان کرنے میں کوئی نخل نہیں کرتے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ
(الکوثر: ۸۱: ۲۲)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :-

”یعنی یہ پیغمبر پر قسم کے غیب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے، اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکام شرعیہ سے، مذاہب کی حقیقت و بطلان سے یا جنت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے اور ان چیزوں کے بتلانے میں آپ ذرا نخل نہیں کرتے۔“

بعد میں وہ پیغمبر علیہ السلام کے علم غیب کے بیان کے پیش نظر لکھتے ہیں:

دو کا ہنوں کو ان سے کیا نسبت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو محض غیب کی جزئی اور نامکمل بات وہ بھی جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں اور اتنی بات میں بھی نخل ہوتے ہیں۔“

قرآن حکیم میں احوال غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

(الف) اُمم سابقہ کے احوال و واقعات
(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

قرآن حکیم نے اُمم سابقہ اور گزشتہ انبیاء کے حوالے سے بہت واقعات و حالات بیان کیے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے

(الف) اُمم سابقہ کے احوال و واقعات

سے موجود ہی نہ تھا اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں تھا لیکن وہ اس قدر محرف و تبدیل صورت میں تھا جس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی۔ قرآن نے ان احوال و واقعات اور انبیاء کی تعلیمات خدمات کو سند تصدیق عطا کر دی۔

اس لیے اس کا لقب مُصَدِّقٌ لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا قرار پایا۔ قرآن نے

کئی مقامات پر حضرت آدمؑ، حواؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اسماعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، خضرؑ، سلیمانؑ، داؤدؑ، یونسؑ

ذوالکفل، صلح، شعیب، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ و مریم اور اصحاب کہف وغیرہم کے حالات کا بیان ہے۔ انکے علاوہ قوم ہود، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور دیگر اقوام و مل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں اسی قبیل کے متعدد قصص بیان کیے گئے ہیں۔ کئی علماء نے "قصص الانبیاء" کے موضوع پر باقاعدہ تصانیف رقم کی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے اعجاز اور اس کی صحت و حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کی زبان سے جس نے نہ کوئی تاریخ پڑھی ہو اور نہ کسی مورخ سے علمی استفادہ کیا ہو، ان احوال و واقعات کا بیان ہونا پھر اس کا بعض روایات اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی تردید اور بعض کی تصدیق کرنا۔ بلاشبہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ جب قرآن نے اپنے منکرین و مخالفین کے سامنے خود اپنے بیان کردہ قصص کو اٹھایا (غیب کی خبریں) سے تعبیر کیا تو کسی بھی دشمن کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ان قصص و واقعات کا کوئی زبانی یا کتابی ماخذ بنا کر قرآن کے اس دعوے کی تردید کر سکتا اور یہ کہہ سکتا کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو، حالانکہ تمہیں تو یہ معلومات فلاں ذریعے سے حاصل ہوئی ہیں" لیکن تاریخ علم شاہد ہے کہ آج تک یہ بات کوئی نہ کہہ سکا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیران کن بیان حوالہ غیب کا دوسرا پہلو تھا جو مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے متعلق تھا۔

مستقبل کی پیشین گوئیاں (ب) پیشین گوئی کا طریقہ کسی دعویٰ کی صحت و حقانیت کے اثبات میں سب سے زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ حقانیت قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت مؤثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں۔ جن میں ظاہراً ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مخالفین قرآن وہ پیشین گوئیاں سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و واقعات میں بدلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابل انکار حہد بن چکا ہے۔ جو زبان حال سے قرآن کی صداقت و حقانیت کا اعلان کر رہا ہے۔ ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ غلبہ رومی پیشین گوئی | یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

الْمَغْلُوبَةُ رُومٌ مِّنْ دُونِ الْمَدِیْنَةِ ۚ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلْبِهِمْ مَسْفُورُونَ ۚ
فِي بَيْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلِ وَمِنْ بَعْدِ
(الروم، ۳۰: ۱ تا ۲)

الم - قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں جن کی حد نو برس ہے۔ حکم اللہ ہی کا ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی۔ یعنی ۶۱۲ عیسوی میں۔ جبکہ ایرانیوں کے مغلوبے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو بالآخر ۶۱۶ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس جنگ میں بعض مورخین کے مطابق رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو نذر آتش کر دیا گیا اور سلطنت روم کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈ

دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعیدانقیاس کوئی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ کیونکہ ہر قتل کی حکومت کے یہ سال سلطنت روم کی تنہا ہی وفات کے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہر حال ان نامساعد و ناموافق حالات میں قرآن نے غلبہ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لیے بضع سین کہہ کر نو برس تک کی حد مقرر کر دی۔ متدرک، حاکم اور ترمذی کے باب "تفسیر سورہ روم میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "بضع کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے" اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخری حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے رہے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغاز شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تین مردہ میں پھر جان پیدا ہو گئی۔ وہ اسی کاہل و عشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیر قیادت منظم ہو کر ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نو برس رومی فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایہ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر و جلد و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتح مکہ کی پیشین گوئی | ۱۱ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور مایوسی پائی جاتی تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لیے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اطمینان قلب کے لیے قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کا اعلان فرمایا۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (الفتح: ۱۰۸) ہم نے تمہارے لیے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے۔ اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو، بلکہ یہ درحقیقت پیشین خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی صورت میں فرمایا گیا۔

لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ
الْمِنِينَ مَخْلَفِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمَقْصِرِينَ
لَا تَخَافُونَ (الفتح: ۲۷) بے شک تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ اگر اللہ چاہے
ان من امان سے اپنے سروں کے بال منڈواتے یا ترشواتے
ہونے بے خوف ہو کر۔

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۱۱ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجہً اس صلح نامہ کی کامیابی و کامرانی کو دل و جان سے تسلیم کر لیا اور کفار مکہ ہی اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

۳۔ فتح خیبر کی پیشین گوئی | غزوہ خیبر کی فتح کے باوجود بھی سورہ الفتح میں پیشین گوئی کی گئی۔ ارشاد فرمایا گیا۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ

عنقریب کہیں گے تیجھے پیچھے رہنے والے جب

تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دینا۔

مَنَامٍ لِّتَأْخُذُوا مَا دَرُونا أَنْتَبِعْكُمْ

(الصق: ۳۸: ۱۵)

جو لوگ حدیبیہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں آئے تھے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح خیبر کی پیشین گوئی بھی دی اور صراحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ غزوہ خیبر میں تمہارے ہاتھ بہت سارا مال غنیمت بھی آئے گا لیکن ہم نے وہ مال غنیمت صرف ان مجاہدین کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ لینے والے اس مال غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کی صداقت بھی تاریخ عالم کے صفحات پر نمایاں انداز میں مرقوم ہے، خیبر فتح بھی ہوا اور بے شمار مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۳۔ غلبہ اسلام کی پیشین گوئی | سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشین گوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکین و استخلاف اور اقتدار و استحکام کی خوش خبری سنائی گئی تھی حالانکہ اس وقت روم و ایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق و مغرب پر اس طرح قابض و متصرف تھیں، جس طرح آج امریکہ اور روس۔ صحرائے عرب کے ان مینوں کے بارے میں اس بے سرو سامانی کے عالم میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ بھی بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور شوثر طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تڑپتی ہوئی تھیں۔ اندیس حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَاَيُّكُمْ
لَهُمْ دِيْنُهُ الَّذِي ارْتَضٰ لَهُمْ وَلِيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اٰمَنًا
(النور: ۲۳: ۵۵)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ضرور تمہیں زمین میں حکومت دے گا جس طرح پہلوں کو دی تھی اور ضرور ان کے لیے ان کا وہ دین (اسلام) جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، مستحکم کر دے گا اور ضرور ان کے سابقہ خوف کو امن میں بدل دے گا۔

اس پیشین گوئی کا عملی ظہور بھی چشم فلک نے دیکھ لیا۔ عہد رسالت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ روز افزوں ترقی پذیر ہوا۔ عہد خلافت راشدہ میں روم اور ایران سمیت قریباً ۱۰ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ عہد فاروقی میں بلوچستان کی سرحدوں تک مسلمان علم اسلام لے کر پہنچ چکے تھے۔

ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپین سے آگے سرحد فرانس تک، مشرق میں سندھ اور ملتان تک، مزید اسیل ماوراء النہر سے آگے سرحد چین تک وسطی ایشیا، شمالی افریقہ اور دنیا میں انسانیت کے کثیر ترین حصے پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ سلطنت اسلام کا پر شکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم و دائم رہا۔ زوال بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر عثمانی ترکوں کی زیرِ قیادت ملت اسلامیہ کی سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبہ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصفہ عالم پر شہود پذیر رہا۔

اس طرح کی پیش گوئیاں جو قرآن نے بیان کیں اور اپنے اپنے وقت پر علم خارج میں واقعہ بن کر حقیقت قرآن کی حتمی دلیلیں بنتی رہیں تعداد میں اتنی ہیں کہ ان کا احصا و شمار آسانی سے نہیں کیا جاسکتا۔

قرآنی اعجاز کی دلیل ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیر ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی، قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے بلکہ معیار صداقت و حقیقت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں کامل یقین کے میسر آنے کی جس نذیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بہر صورت تجربی توثیق، مشاہدہ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔ موضوع مندرکہ کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ نتیجہ خیزی کا مفہوم اور یقین کا تصور بھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مطالعہ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کائنات اس لیے کروایا گیا تھا کہ انہیں یقین کے اعلیٰ تمام پرفائز کیا جاسکے۔ ارشاد باری ہے۔

وَ كَذَلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ لِيَكُوْنٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الانعام، ۶۰: ۷۹) ہو سکے۔

حالانکہ کائنات ارض و سما کے وجود پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو پہلے ہی تھا اور یہ بھی یقیناً ان کے ایمان میں شامل تھا کہ آسمان زمین کی ساری حکومت سلطنت کا مالک باری تعالیٰ ہے لیکن ایمان کے بعد یقین کو نتیجہ مشاہدہ پر منحصر قرار دیا گیا۔ اسی طرح باری تعالیٰ کی قدرت امت و احیاء پر بھی ابراہیم کا بحیثیت پیغمبر ایمان کامل تھا کہ وہ ذات جس طرح ماتی ہے اسی طرح زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے عرض کیا۔

رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تَحْيِي الْمَوْتٰی (البقرہ، ۲۰: ۱۳۶) لے میرے رب! مجھے مشاہدہ کروا، تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

اس مطالبہ پر ارشاد باری ہوا۔

اَوْ كَمْ قَوْمٍ كَذَبُوْا اٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا سٰكِبِيْنَ ۝ (البقرہ، ۲۰: ۱۳۶) کیا تو اس بات پر ایمان نہیں رکھتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ذات حق بھی اس امر سے بے خبر نہ تھی کہ ابراہیم میری قدرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن سوال کیوں کر ہے ہیں۔ قدرت باری پر ایمان کے بغیر پیغمبری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور ابراہیم تو جدال انبیاء تھے۔ یہ سوال و جواب محض اس مقصد کے لیے تھا کہ خلق خدا ادھر متوجہ ہوا اور قدرت الہیہ کے معرضی نتیجے کا مشاہدہ کر کے حضرت ابراہیم کی طرح دولت یقین سے بہرہ ور ہو سکے۔ آپ نے عرض کیا۔

قَالَ بَلٰی وَ لٰكِنْ لَّيَطْمَئِنُّ قَلْبِيْ (البقرہ، ۲۶: ۳۶) انہوں نے جواب دیا (اے باری تعالیٰ) ایمان تو رکھتا ہوں لیکن مشاہدے سے اطمینان قلب چاہتا ہوں

چنانچہ آپ نے پرنڈوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر متفرق طور پر رکھ دیا۔ اور انہیں نلادی تو وہ زندہ ہو کر دوڑنے پھرتے ہوئے چلے آئے۔ جب انہوں نے حکم الہی کی یہ نتیجہ خیزی اپنی آنکھوں سے دیکھی

تو فرمایا گیا۔

وَاعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

(البقرہ، ۲: ۲۶۰)

پس اب جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام نے بھی مردوں کے زندہ ہونے کے امر کا معروضی نتیجہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ انہیں سو سال کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔ ان کی سواری کو ان کے سامنے مٹی میں سے زندہ کیا گیا اور دوسری طرف انہیں یہ بھی دکھایا گیا کہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کا کھانا ابھی باسی نہ ہوا تھا۔ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے یہ نتائج اپنی اسکو سے دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السلام فرمانے لگے :

أَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

(البقرہ، ۲: ۲۶۰)

میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مشابہہ نتائج سے حاصل ہونے والا یہ علم ایمان کے لیے نہ تھا۔ کیونکہ ایمان بالغیب تو پہلے ہی موجود تھا یہ علم حصول یقین کے لیے تھا۔

مذکورہ بالا تین واقعات سے استشہاد و استدلال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن کے نزدیک یقین نتیجہ خیزی کی اس ضمانت کا نام ہے جو معروضی نتائج کے مشاہدے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اسی لیے قرآن کہتا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ

(الجز، ۱۵: ۹۹)

اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے معروضی کامیابی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت میسر آجائے۔

اسی مشاہدے کی منزل کا نام یقین ہے جس تک پہنچنے کے لیے حکم عبادت دیا جا رہا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی کے پیش کردہ نظریہ علم میں ایجابی اور منفی دونوں طرز کے نتائج پیدا کرنے کی ضمانت موجود ہو تو اس علم کو یقینی علم کہا جائے گا اور یہی خوبی قرآنی علم و ہدایت کا طرہ امتیاز ہے۔

یقین اور نتیجہ خیزی کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد قرآن مجید کا یہ عجز اور اس کی حقانیت کی یہ داخلی دلیل سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلہ علم و ہدایت کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضمان ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشادات قرآنی ملاحظہ ہوں۔

• قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا و آخرت میں خوف و غم کی محیط کیفیت سے نجات دلا دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعویٰ کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا۔

فَأَمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنْ هُدًى فَمَنْ

تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

هُمْ يَحْزَنُونَ - (البقرہ، ۲: ۳۸)

پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آجائے تو تم میں سے جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس اُس کو نہ کوئی خوف ہے گا اور نہ کوئی غم

• اسی طرح قرآن اِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (بیشک خدا کا گروہ ہی غالب ہونے والا ہے)

کا اعلان کر کے اس دنیا میں باطل کے مقابلے میں غلبہ دین کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ محض اس لیے نہیں کیا گیا کہ

مسلمان اس کی آرزو تو کر لیں۔ لیکن اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی۔

تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ غم کرنا، بیشک غلبہ کا میاں تم ہی کو ملے گی۔ اگر تم (صحیح طور پر) صاحب ایمان ہے۔

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ
إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
(آل عمران، ۳: ۱۳۹)

پس تم سستی نہ کرو اور نہ باطل سے سمجھتو کرو، پھر تم ہی غالب آکر رہو گے، اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششوں کو بے نتیجہ (یا خالصے میں) نہیں جانے دے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔
فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْوِ وَأَنْتُمُ
الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يُبْرِكُمْ
أَعْمَالَكُمْ
(محمد، ۲۴: ۲۵)

اور جو اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کو (صحیح معنوں میں) دوست بنائے بیشک (وہی) اللہ کا گروہ (ہے جو) غالب کا میاں ہوگا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔
وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ
(المائدہ، ۵: ۵۶)

اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

اور بے شک ہمارا یہ وعدہ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو انبیاء و رسل تھے پہلے ہی سے چوچکا ہے یقیناً ہماری مدد و نصرت انہیں کو حاصل رہی ہے اور یقیناً ہمارا ہی لشکر (یعنی گروہ) باطل کے مقابلے میں ہمیشہ غالب آتا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ
وَإِنَّ حِزْبَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ
(الصفّات، ۲۴: ۱۴۱-۱۴۲)

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کا وعدہ محض دعوے سے نہیں بلکہ فی الواقع اس کا اگر حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کش مکش میں اہل حق کو غالب اور فتحیاب کر دینے سے ہی پورا ہو سکتا ہے اور یہی دعویٰ قرآن کی نتیجہ خیزی ہے۔

قرآن مجید انبیاء سابق کے حوالے سے اقوام حق و باطل کی منظم کش مکش کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے۔
اور ہر گز قوم نے اپنے رسول کے بارے میں راہہ کیا کہ اسے پکڑ لیں۔ یعنی شکست دے دیں اور وہ باطل و حق کے ذریعے اس سے جھگڑتے بھی رہتے تاکہ اس شخص سے حق کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کو زائل کر دیں یعنی نتائج کے اعتبار سے پیغمبرانہ جدوجہد کو ناکام بنا دیں۔ لیکن

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ
وَإِنَّ حِزْبَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ
(الصفّات، ۲۴: ۱۴۱-۱۴۲)

أَلَمْ يَكُنْ أَصْحَابُ النَّارِ

(المؤمن: ۴۰، ۴۱، ۴۲)

ہوا یہ کہ میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے کر سخت
لے دی۔ پس میری سزا کیسی تھی؟ اور (جس طرح اس دنیا
میں میرا یہ وعدہ کہ حق کو فتح اور باطل کو ذلت آمیز سخت
ہوگی، نتائج کے لحاظ سے سچا ثابت ہوا۔) اسی طرح
تیرے رب کی یہ بات بھی کفار پر حق ثابت ہوئی کہ وہی
آگ میں جلیں گے۔

اگر اس آیت کے مضمون پر غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن نے اس دنیا میں اہل حق کی نتیجہ
خیز کامیابی کو آخرت کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ جو قرآن آخرت میں اہل حق کی کامیابی اور اہل باطل کی ذلت رسوائی کے تصور
کی حقیقت صداقت کے لیے اس دنیا میں وعدہ غلبہ حق کی تکمیل کو بطور ثبوت پیش کر رہا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس قرآن
نے اپنے ہر دعوے کی صداقت اور اس دنیا میں اسکی نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا نہ کی ہوگی۔ عقل سلیم اس امر کو تسلیم کرنے سے قاصر
ہے جو ذہن اس تصور پر تامل اور مضمحل ہے کہ "جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے مطلوبہ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس دنیا میں اس کی کوئی
ضمانت نہیں۔ یہاں کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے،"

وہ دین حق کی صحیح معرفت سے محروم ہے اور وہ لاشعوری طور پر قرآنی ہدایت کی عظمت اور صداقت و حقیقت کا
انکار کر رہا ہے۔ یہی پہلو تو درحقیقت قرآنی اعجاز کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کا کیا ہوا ہر وعدہ اسی دنیا میں نتیجہ خیزی
کے ذریعے اپنی صحت و صداقت کا ثبوت فراہم کرنا ہے اور یہاں معروضی نتائج کا مشاہدہ کروا کر تنبیہ کرتا ہے کہ اسی
طرح آخرت میں بھی کامیابی اہل حق کو اور ناکامی اہل باطل کو نصیب ہوگی۔ قرآن کا ہر دعویٰ ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت
ہے۔ شاعرانہ تعلق نہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا۔

اور ہم نے رسول ﷺ کو شعر نہیں سکھائے

اور نہ وہ ان کے شایان شان تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی

نصیحت ہے اور روشن قرآن ہے۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي
لَهُ بِإِذْنِ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ

(البین: ۳۶، ۳۷)

اس آیت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ قرآن کے دعاوی اور اعلانات شاعرانہ تعلق نہیں ہیں
جن کا عملی زندگی اور نتیجہ خیزی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ یہ تو ایسی کھلی اور روشن حقیقتیں ہیں، جو خود ہی اپنی صداقت و
حقیقت پر دلالت کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی تاثیرات و خصوصیات کا ذکر مختلف عنوانات کے ذریعے کیا ہے، اگر ان کی معنوی دلالت پر
غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہر عنوان کے تحت اپنی کسی نہ کسی فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ مثلاً
قرآن - ہدایت ہے - اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يُدِيْتُ
لِلنَّبِيِّ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء: ۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تاریخی وظلمت اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر
منزل مقصود تک پہنچا دینے کی جتنی و قطعی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — تصدیق ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَكِنْ تَصَدِّقُوتَ الَّذِي بَيَّنَّ يَدَيْهِ (یوسف : ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن صحف ما قبل کی آسمانی حیثیت اور ان کے احکام و تعلیمات کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — تفصیل و تبیین ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف : ۱۱۱) اَوْ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حقانیت کائنات کے تمام گوشوں کی تفصیلی وضاحت اور علمی و فکری تشکیک کے خاتمے کی یقینی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — رحمت ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (یوسف : ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو انفرادی اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات کی اطمینان بخش ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — شفا ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَشِفَاءٍ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (یونس : ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ہر فرد اور معاشرے کو داخلی و خارجی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کے امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — موغلت ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ (یونس : ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تنبیہ، تنذیر اور تبشیر کی صورت میں نفسیاتی تبلیغ کے ذریعے شعور انسانی کو طلب کمال اور اس کے حصول کی حتمی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — بشارت ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرًا لِلْمُسْلِمِينَ (نمل : ۱۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن دنیا و آخرت میں خیر اور حق کو نثر اور باطل کے مقابلے میں فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کی بشارت انجیز ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — فرقان ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (بقرہ : ۱۸۰) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان واضح نتیجہ خیز اور فیصلہ کن امتیاز کے ظہور کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — مخرج من الخوف والحرز ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ : ۳۸) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن فرد اور معاشرے کو اپنی پیروی کی صورت میں ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خوف و غم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

• قرآن — روشن کتاب ہے — اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا:

تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ (النمل : ۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن واضح اور

فیصلہ کن انداز میں غلبہ حق کی مدد و جہد کے تمام مراحل کے لیے جملہ تفصیلات اور قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی حیثیات جہاں اپنی تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے عام ہیں وہاں ان کا فیضان بھی عام ہے اور فیصلہ خیز بھی۔ خواہ اس ابدی اور آفاقی اصول اور ضابطے کو مسلمان اپنائیں یا غیر مسلم۔ چونکہ قرآن کا فیضان کائناتی ہے اور اس کا دائرہ خطاب بھی آفاقی ہے۔ لہذا بلا امتیاز رنگ و نسل اور علاقہ و مذہب جو قوم و ملت اور طبقہ افراد انسانی قرآنی تعلیم اور ہدایت کے جس گوشے کو عملاً اپنالے گا، قرآن کا فیصلہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اسی کے حق میں ملے گا اور نتیجہ خیز ہوگا۔ قرآنی تعلیم اپنی نفع بخشی اور فیض رسانی کے باب میں کسی کے لیے بھی جانب دار نہیں ہیں۔

اس بحث کی وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ آج مسلمان قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود علم کفر کے مقابلے میں شکست خوردہ، کمزور ناتواں اور پریشان حال کیوں ہیں؟

قرآنی تعلیمات کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی ان پر محض ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کو انسانی زندگی میں واقعہ بنانے سے میسر آتی ہے۔ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر ان تعلیمات کو عملاً خیر باد کہہ چکے ہوں اور کفر و طاغوت کے علمبردار اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں ان تعلیماتی حقائق کو عملاً واقعہ بنا چکے ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کائناتی کتاب کی نتیجہ خیز ہدایت کے فیضان سے محروم رہیں۔ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا وعدہ بالعموم اس کی تعلیمات کے حوالے سے ہے نہ کہ افراد و طبقات کے حوالے سے، اس لیے جو کوئی بھی کسی مخصوص قرآنی تعلیم کی نتیجہ خیزی کی شرائط کو پورا کیے بغیر نتیجہ خیزی کی آرزو کرے گا یہ آرزو محض عبت ہوگی اور جہاں تک اخروی فلاح کا تعلق ہے تو وہ ہے ہی صرف مومنین و صالحین کے لیے۔ اس لیے اس میں سے ہر ایک برابر حصہ نہیں لے سکتا۔ قرآنی ہدایت و تعلیمات اور اس کے اصول و ضوابط کے درمیان مذکورہ بالا امتیاز کو سمجھ کر ہر سوال کا نسلی بخش جواب میسر آسکتا ہے۔ اگر قرآن کے بیان کردہ تمام ضابطوں کی افادیت، تاثیر اور نتیجہ خیزی صرف ایک کلمہ گو طبقے تک محدود کر دی جائے تو اس کی آفاقی و کائناتی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن پوری نوع انسانی کی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لیے نازل ہوا ہے اور رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت بھی اسی طرح عالم گیر ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ
جَمِيعًا۔ (الاعراف، ۷: ۱۵۸)
اے نسل بنی آدم! میں تم سب کی طرف اللہ
کا رسول بن کر آیا ہوں۔

چنانچہ جو کوئی جتنا قرآنی ہدایت کو عملاً قبول کرے گا وہ اسی قدر حصہ پالے گا۔ اسی قرآنی نتیجہ خیزی کی ضمانت کا نام مشیت الہی ہے۔ رب ذوالجلال نے آفاقی اصول و ضوابط بنی نوع انسان کو عطا کر دیے ہیں اور انہیں ان کے رد و قبول میں آزاد چھوڑ دیا ہے جو کوئی ان پر عمل کرے گا یا ان سے انحراف کرے گا۔ مقررہ ایجابی اور منفی نتائج جھگٹ کر رہے گا۔ مسلم ہو یا غیر مسلم مشیت الہی کے اس نتیجہ خیز فیصلے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا۔ قرآنی ہدایت کی یہ خوبی اس کی حقانیت اور اعجاز کی ایسی ابدی دلیل ہے جس کا مشاہدہ آج بھی زوال پذیر ملت اسلامیہ کر رہی ہے۔

غیر اسلامی قوتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی پستی نے جب انہیں ذہنی اور فکری طور پر بھی مضلل کر دیا تو ان کی سوچ ہر لحاظ سے ناامیدی کا شکار ہو گئی اس مایوسی کی بنا پر شعوری یا لاشعوری عمل کے باعث

تین تصورات نے جنم لیا۔

○ ایک یہ کہ خلافتِ اسلام کے قابل عمل ہونے کی نسبت اعتماد باقی نہ رہا۔ بنا بریں انداز فکر یہ ہو گیا کہ اسلام چودہ سو سال پہلے کی تہذیب ہے اس کے تہذیبی و سماجی فضائل اور سیاسی و معاشی ضوابط آج کے بدلے ہوئے حالات میں کیوں کر قابل عمل ہو سکتے ہیں۔

○ دوسرے یہ کہ مستقبل میں مسلمانوں کے احیاء اور دوبارہ عروج حاصل کر سکنے کی کوئی امید اور زندگی باقی نہ رہی۔ اربابِ علم و دانش کا ذہن اس بات پر مطمئن ہو گیا کہ ہزار بارہ سو سال سے زائد عرصہ تک پوری دنیا پر حکمرانی کر لینے کے بعد زوال ایک فطری امر تھا اسلام کے غلبہ و عروج کی یہی عمر طبعی تھی جو اس نے پوری کر لی اس سے زائد مدت کے لیے اس کے غلبے کا باقی رہنا ممکن نہ تھا لہذا اب اس میں وہ قوت - فعالیت اور تاثیر باقی نہیں رہی جو مستقبل میں مسلمانوں کے از سر نو احیاء کی ضمانت دے سکے۔

○ تیسرے یہ کہ قرآن و سنت کی ہدایت کی نسبت نتیجہ خیزی کا یقین ختم ہو گیا۔ مذہبی ذہن نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ خیال وضع کر لیا کہ اسپر عمل پیرا ہونا محض اُفروی فلاح کا ضامن ہے اس کا نتیجہ آخرت کے اجر و ثواب کی صورت میں متحقق ہو گا اور ہی اصل کامیابی ہے دنیا میں معروضی نتائج کا حصول ضروری نہیں۔ اس کا اگر کہ حیات میں ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق عمل اور جدوجہد کرتے چلے جائیں۔ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں کامیابی ظاہر اُحتیٰ کہ ہو یا باطل کو۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ کیوں کہ نتیجہ خیزی کی ضمانت ہمیں نہیں دی گئی اور نہ ہی نتیجہ خیزی معیارِ صداقت و حقانیت ہے۔ صرف آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔

موضوع زیر بحث اس تیسرے تصور سے متعلق ہے کہ ایک خاص مذہبی ذہن نے قرآن و سنت کی ہدایت سے نتیجہ خیزی اور معروضی واقعاتی کامیابی کی ضمانت کا تصور اس لیے خارج کر دیا ہے کہ اس کی اپنی جدوجہد مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکی، سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر غیر اسلامی قوتوں کا اثر و نفوذ اس کی خوشوشوں سے کم نہیں ہو سکا۔ باطل طاغوتی طاقتوں اور فنون کے مقابلے میں اسلام کے نام پر کی جانے والی کاوشیں مطلوبہ تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں۔ اندریں صورت دو ہی رد عمل ممکن تھے۔

○ ایک یہ کہ اپنے پروگرام اور طریق کار کو ناقص اور اصلاح طلب تصور کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے۔

○ دوسرے یہ کہ اسلام اور قرآن و سنت کی ہدایت میں سے کامیابی اور نتیجہ خیزی کا تصور حذف کر لیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے کامیابی یا ناکامی کوئی فیصلہ کن امر نہیں ہے اس سے پروگرام کی صحت و عدم صحت یا صداقت علم متعین نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے ہمیں صرف جدوجہد کے لیے مامور اور مکلف کیا ہے۔ نتائج کا معاملہ ہمارے سوچنے کا نہیں۔

اس ذہن نے باطل کے مقابلے میں اپنی شکست کی خفتِ مذمت کو چھپانے کے لیے دوسرا موقف اختیار کر لیا۔ اور

اس کو اسلامی تصور کا نام دے دیا۔ مستزاد یہ کہ باوجود ناکامی کے اپنی فکری و عملی قیادت کو بحال رکھنے کی خاطر اس نے ایک نظم

یہ بھی کیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر تبلیغی جدوجہد اور پیغمبرانہ مساعی کے باوجود نتائج کے لحاظ سے ناکامی کا الزام لگا دیا۔ اور اس

امر کا پرچار کیا گیا کہ ہزاروں انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے۔ انھوں نے مسلسل جدوجہد کی پے در پے کوششیں کیں

لیکن معروضی نتائج کے لحاظ سے کامیابی حاصل نہ کر سکے اور وہ معاذ اللہ ناکام ہو کر واپس اپنے مالک سے جا ملے۔
یہ نقطہ نظر محض اپنی مدافعت کے لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ جب خدا کے برگزیدہ انبیاء نے نتیجہ ناکام ہوتے رہے
ہیں تو ہماری ناکامی سے کیا فرق پڑتا ہے اس پرستزادیہ کہ اس تصور کو قرآن کی طرف منسوب کر دیا گیا۔
پیغمبرؐ جہد و جدوجہد کو نتائج کے لحاظ سے ناکام سمجھنے والے ذہن نے بزمِ خویش انہی ناکامی کے اسباب بھی تلاش کر لیے کبھی انہی
محض انفرادی کوششوں کو (معاذ اللہ) ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا گیا یعنی وہ اس لیے مقصد حاصل نہ کر سکے اور اپنے اپنے ادوار
میں اسلامی نظام نافذ نہ کر سکے کہ ان کی جدوجہد اجتماعی طور پر بھرپور انداز سے نہ ہوئی تھی۔ کبھی تنظیم کے فقدان اور کبھی تربیت یافتہ
جتنے اور گروپ کے فقدان کو ان کی ناکامی کی وجہ تصور کیا گیا۔

علیٰ ہذا القیاس انسانی ذہن اپنی قیادت کے تحفظ اور مدامت سے بچاؤ کی خاطر خدا جانے کیا کیا کچھ نہ کہہ گیا۔ گویا ہزاروں انبیاء
اس طرح یکے بعد دیگرے ناکام ہوتے رہے لیکن اس گروہ انبیاء میں سے کوئی نبی بھی ناکامی کے اسباب کو سمجھ کر ان کا تدارک اور
اندفاع نہ کر سکا اور نہ ہی (معاذ اللہ) خالق کائنات جو ان انبیاء کو مبعوث کر رہا تھا خود اس امر کو متعین کر سکا کہ میرے انبیاء
رسل کفار و مشرکین عالم اور منکرین حق کے مقابلے میں نتائج کے لحاظ سے مسلسل ناکام واپس لوٹ رہے ہیں۔ اس طرح میری
ہدایت کا مذاق ہو رہا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کا سدباب کس طرح ہو سکتا ہے تاکہ جس مقصد کے لیے
انبیاء کو بھیجا جا رہا ہے وہ اس میں کامیاب لوٹ سکیں۔

اگر یکے بعد دیگرے سینکڑوں انبیاء کو (معاذ اللہ) ایسی بے نتیجہ جدوجہد کے لیے دنیا میں بھیجا تھا کہ باطل کو شکست ہی نہ
دی جاسکے تو آخر اس کاروائی کا مقصد کیا تھا؟ کیا (معاذ اللہ) صرف انبیاء و رسل اور آسمانی ہدایت کی تضحیک مقصود تھی؟ یقیناً
نہیں۔ ایسا سوچنا بھی کفر ہے اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ہمیں انبیاء کی جدوجہد کی نسبت نتائج کے لحاظ سے ناکامی کے مفروضے
کو غلط اور بے بنیاد قرار دینا ہو گا اور اس امر کا اعتراف کرنا ہو گا کہ کوئی بھی نبی نتائج کے لحاظ سے کبھی ناکام واپس نہیں لوٹا
بلکہ پیغمبرؐ نہ جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے کا تصور ہی خلاف اسلام ہے اور قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ایسا خیال ہرگز اپنے
ذہن میں نہیں لاسکتا۔

یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ قرآن حکیم میں بعض انبیاء سابقین جن میں نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ، لوطؑ اور اسی طرح چند دیگر اسماء
بطور خاص قابل ذکر ہیں کے بیان کیے گئے حالات کو صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا۔ ہم اسلام کے سیاسی غلبے اور نفاذ کو بلا انبیاء ہر
نبی کے مقصد بعثت کے طور پر بنائے قیاس از خود متعین کر لیتے ہیں کہ ہر نبی کم از کم اسی کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے
مبعوث ہوا ہو گا یہ تصور ہمارا خود تراشیدہ ہے اور پھر اس خود ساختہ تصور کی بنیاد پر ہم ان کی جدوجہد کا مطلوبہ نتیجہ دو لوگ انداز
میں دیکھنا چاہتے ہیں جو حسبِ خواہش دکھائی نہیں دیتا تو ہم اس پر ظاہری ناکامی کا الزام دھر دیتے ہیں۔ یہ انداز جستجو ہی
غلط ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہر نبی کا مقصد بعثت اس کی جدوجہد کا رخ اور غرض و غایت از خود متعین کرنے کے بجائے
خود انہی انبیاء کی زبانی قرآن سے متعین کریں کہ وہ اپنے مقصد بعثت کے بارے میں خود کیا بتاتے ہیں اور پھر ان کے
اپنے بیان کردہ مطمع نظر اور مقصد جدوجہد کی روشنی میں قرآن سے نتائج کے مبینہ طور پر پیدا ہونے یا نہ ہونے کا سوال
کریں اس طرح کسی کی کامیابی یا ناکامی کو صحیح طور پر جانچا جاسکتا ہے۔ جب بھی کوئی نبی کسی قوم یا طبقے کی طرف

پورا کرے یعنی اسے مطلوبہ منزل اور نتیجے تک پہنچانے

اسی اصول کی مزید وضاحت قرآن سے ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہوتا ہے۔

وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ
بِكَلِمَتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ
لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ
الْمُجْرِمُونَ (الانفال ۸: ۷-۸)

اور اللہ کا ارادہ ہے کہ اپنے وعدوں کے ساتھ
حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کو جڑ سے کاٹے
تاکہ حق کا بیج ہونا اور باطل کا جھوٹ ہونا آشکار
ہو جائے گو مجرم اس کو ناپسند سمجھتے رہیں۔

اس آیت میں بھی حق کا غالب آنا اور باطل کا نتیجہ شکست کھا جانا۔ احقاق حق اور ابطال باطل کی دلیل قرار
دی گیا ہے کہ یہ امر طے ہو گیا کہ پیغمبر نے جدوجہد کا اپنے نتائج کے لحاظ سے کامیاب ہونا احقاق حق کے لیے ضروری
ہے ورنہ دنیا میں کلمات الہیہ کی صحت کا کوئی فیصلہ کن طبعی ثبوت فراہم نہ ہو سکے گا۔ قرآن نے انبیاء سابقین کے
حوالے سے اس امر کی وضاحت یوں کی ہے۔

وَإِنَّ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ
وَإِنَّ كَذِبُكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ
وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ
كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ
نَكِيرِ

اور کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں ڈرسانے والا
نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو
کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے لوگ بھی جھٹلاتے
ہے ہیں ان کے پاس بھی اس کے رسول
کھلے دلائل، صحائف اور روشن کرنے والی کتاب
یعنی واضح اور نتیجہ خیز پروگرام لے کر آئے تھے جن کی
انہوں نے مخالفت کی۔ لیکن میں نے انہیں پکڑ
لیا۔ یعنی انہیں ناکام بنا دیا۔ پس میرا عذاب اور گرفت
ان کا انکار کرنے والوں کے لیے کیسی تھی۔

(فاطر، ۲۵: ۲۳-۲۶)

مندرجہ بالا قرآنی آیات کا ایک ایک لفظ کتنے و اشکاف انداز میں اس حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے کہ پیغمبر نے
جدوجہد بھی کسی دور میں بھی بے نتیجہ نہ رہی۔ اس کے نتائج کا پیدار نا خود غیرت الہیہ کا تقاضا تھا اس لیے وہ نتیجہ خیز ہوتی
رہی اور ہر باطل قوت جو اس کے ٹکرائی نہ ضرر خود ناکام و نامراد ہو گئی بلکہ اس کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا اسی سورت
میں انبیاء سابقین کی دعوت کی نتیجہ خیزی بیان کرتے ہوئے قرآن نے اعلان کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ
حَقٌّ حَقٌّ (فاطر، ۲۵: ۵)

اے بنی نوع انسان! خدا کا وعدہ حق ہے
(اے دنیا کی کوئی طاقت غلط ثابت نہیں کر سکتی)

اب اسی فلسفے کی روشنی میں سورہ ہود کا مطالعہ فرمائیے۔ انبیاء سابقین کی جدوجہد اور اس کے نتائج کے
بارے میں جتنے شبہات پیدا ہو سکتے تھے آیت نمبر ۲۵ سے آیت نمبر ۲۲ تک تمام کا تسلی بخش جواب آ گیا ہے۔
حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ ہوں یا حضرت شعیبؑ حضرت لوطؑ ہوں یا حضرت موسیٰؑ

ہر ستم نے مبعوث ہوتے ہی اپنی قوم کے سامنے اپنی بعثت کا مقصد بیان کر دیا اور کہا کہ میرے فے صرف دو چیزیں لگائی گئی ہیں۔

○ ایک یہ کہ پیغام حق تم تک پہنچا دوں۔

○ دوسرے یہ کہ اس کی حقانیت، صداقت اور نتیجہ خیزی کا مشاہدہ تمہیں اسی زندگی میں کرادوں۔

دعوت کے دوسرے پہلو کے لیے ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو چیلنج کیا۔ جو کوئی میری اطاعت کرے گا۔ میرے پروگرام کی تائید کرے گا اور میری جدوجہد میں شریک ہو جائے گا وہ نجات یافتہ ہوگا اور جو میری مخالفت کرے گا اور حق کے راستے میں مزاحم ہوگا اسی دنیا میں اور میری زندگی میں ہی تباہ و برباد اور نیست و نابود ہو جائے گا۔“

ہر پیغمبر نے جدوجہد اور دعوت کا آغاز اس چیلنج سے ہوا تھا اور پورے قرآن سے ایک شہادت بھی ایسی میسر نہیں آسکتی کہ کسی پیغمبر کی جدوجہد کے نتیجے میں یہ چیلنج پورا نہ ہوا ہو۔ جس جس نے پیغمبرانہ دعوت کو قبول کر لیا یا مردہا اور جس جس نے اس کی مخالفت کی اور مزاحمت سے باز نہ آیا تاریخ علم اور چشم فلک نشاہد ہے کہ وہ اسی پیغمبر کی زندگی میں ہی تباہ و برباد ہو گیا انکار کرنے والی قومیں مٹ گئیں۔ کچھ طوفانوں کی نذر ہو گئیں۔ کچھ طبعی سے گر کر تروبالا ہو گئیں کچھ پتھروں کے عذاب سے ختم کر دی گئیں کچھ کی شکلیں مسخ ہو گئیں۔ کچھ خوفناک آواز اور چنگھاڑ سے تباہ ہو گئیں، کچھ سمندوں میں غرق ہو گئیں اور کچھ قتل غارت کی نذر ہو گئیں۔

الغرض پیغمبرانہ جدوجہد کے دونوں قسم کے نتائج ہر دور میں برآمد ہوئے اطاعت گزار محفوظ ہو گئے اور مکبرین نیست و نابود۔ یہ نتائج بعثت میں آنے والی اقوام و مل کے لیے سامان عبرت تھے یہ ساری تاریخ پیغمبرانہ جدوجہد اور انبیاء و مرسلین کی کامیابی و کامرانی کی تاریخ تھی اسے ان کی ناکامی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَكَلَّا نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ

أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نَشِئْتُمْ بِهِ فُؤَادَكَ

وَجَاءَكَ فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ

وَذِكْرٌ لِلْمُؤْمِنِينَ -

(ہود : ۱۱ : ۱۲۰)

اور یہ سارے کے سارے واقعات جو ہم
احوال رسل میں سے آپ کو سناتے ہیں یہ صرف
اس لیے سناتے ہیں کہ ان سے آپ کے دل کو
تقویت پہنچے اور اس قرآن میں آپ کے پاس
حق کا نکھرا ہوا تصور آگیا اور مومنین کے لیے
عبرت و نصیحت۔

بات بڑی واضح ہے اگر انبیاء کی تاریخ (معاذ اللہ) ان کی ناکامیوں کی تاریخ ہوتی تو اس کے بیان سے حضور
ﷺ کے قلب مبارک کو تقویت نہیں بلکہ تکلیف اور مایوسی ہوتی حالانکہ قرآن اس کے ذکر کو باعث تقویت
فرحت قرار دے رہا ہے۔

اس لیے پیغمبرانہ جدوجہد کی ساری تاریخ کامیابی و کامرانی کی تاریخ ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت و نصیحت
بھی کہ انہیں یہ علم ہو جائے کہ دعوت انبیاء کو ٹھکرانے والے اس طرح نیست و نابود ہو گئے اور ان کے اطاعت گزار اس
اس طرح سرفرو ہوتے۔

قرآن نتیجہ خیز تاریخی لائحہ عمل کا نام ہے | بنا بریں قرآن اپنے دعویٰ اور ان کی نتیجہ خیز لویوں کی ایسی تابناک اہمیت پر مشتمل تاریخ بیان کرتا ہے کہ اس سے احوال زندگی سنوارنے کا حتمی و قطعی لائحہ عمل

میسر آجاتا ہے۔ آج مطالعہ تاریخ میں اس لیے کوئی جان، دلولہ اور اثر انگیزی باقی نہیں رہی کہ یہ صرف اقوام و مل کی ترقی و انحطاط کی داستان سے غنص ہو کر رہ گیا ہے قرآن کے نزدیک تاریخ مختلف اقوام کے حالات کے لیے عبرت انگیز جانتے اور شاہدے کا نام ہے جس سے اپنی ملت کا مستقبل سنوارنے کی نہ صرف امنگ پیدا ہو بلکہ واضح لائحہ عمل بھی متعین ہو سکے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

کیا انہوں نے زمین کے احوال کا جائزہ نہیں لیا کہ
ان کے دل ہوں جن سے سمجھیں یا کان ہوں جن
سے سنیں تو یہ کہ انہیں اندھی نہیں ہوتیں۔ گویا دیکھتی
ہیں لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں
یعنی دیکھنے کے باوجود انہیں عبرت حاصل نہیں ہوتی
اور وہ ماضی سے اپنے مستقبل کے لیے کوئی ہدایت
اخذ نہیں کر سکتے۔

اَقْلَمَ بَصِيرًا وَاِنْ اِلَّا رِجَالٌ
لَّهُمْ قُلُوبٌ يَّعْمَلُونَ بِهَا اَوْ اِذَا
يَسْمَعُونَ بِهَا فَاَنَّمَا لَا تَنْصَى الْاَبْصَارُ
وَلَكِنْ تَنْصَى الْقُلُوبَ الْكٰثِرَ
فِي الصُّدُورِ -

(الحج ۲۲ : ۴۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ قرآن کے مطابق دل بینا سے نہیں کر رہے بلکہ اپنے ہمنی کا جائزہ ایسی بے بصیرتی سے لے رہے ہیں جس میں مستقبل کے لیے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ ایسا مطالعہ جو یاس و ناامیدی کا باعث ہو مردہ ہے۔ کیوں کہ قرآن کے نزدیک مطالعہ تاریخ کا فلسفہ حصول عبرت و ہدایت ہے اور اگر وہ مطالعہ جاندار ہو تو اسی میں مستقبل کے لیے حیات بخشی کی ضمانت بھی مضمر ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

زین کی سیر کرو اور دیکھو کہ مجرم اقوام کا انجام
کیا ہوتا رہا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَانظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ

(النمل ۲۷ : ۶۹)

قرآن خود بھی ایک حیثیت سے انبیاء باسبق کی تاریخ ہے۔ قرآن نے اپنے اندر سابقہ انبیاء و ائم کے حوالے سے تاریخی واقعات کے بیان کیے جانے کا فلسفہ ان لفظوں میں واضح کیا ہے۔

اور یہ جو کچھ ہم آپ پر رسولوں کی خبریں یعنی تاریخ
انبیاء بیان کرتے ہیں اس سے ہم آپ کا دل مضبوط
کرتے ہیں اور اسی میں ہی آپ کو حقیقت سے
آگاہی ہوتی اور اہل ایمان کو موعظت و نصیحت یعنی
بیداری نصیب ہوتی۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَا
الرُّسُلِ مَا نَشِئْتُ بِهٖ فَاَدَّكَ وَجَاءَكَ
فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٌ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(ہود ۱۱ : ۱۳۰)

آیت مذکورہ سے تین اصول مستنبط ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ اسلام کی تاریخ اہل ایمان کے لیے باعث ایقان و تسکین قلب ہونی چاہیے کہ وہ ان کے لیے سرچشمہ حیات ثابت ہو۔

دوسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہل نظر کو حق پرست مل ایک ایسا واضح کائناتی اصول اور ضابطہ میسر آنا چاہیے جس کے ذریعے عروج و زوال کی ایک ہمہ گیر توجیہ ہو سکے۔

تیسرا یہ کہ اسلام کی تاریخ سے اہل بصیرت کو مستقبل کے لیے ایسی موعظت و نصیحت اور واضح ہدایت نصیب ہونی چاہیے۔ جس سے وہ اپنے اجبار و تجدید کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

اگر نظر غائر جائزہ لیں تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ یہ تینوں چیزیں تمہی ممکن ہیں اگر تاریخ اسلام ہر واقعے سے بالآخر ایک ہی نتیجہ اور ایک ہی اصول اخذ ہو رہا ہو۔ وحدت نتائج کے بغیر علم تاریخ محض بے ضابطہ اتفاقات و حادثات کا مجموعہ قرار پائے گا۔ جس کی کوئی عملی افادیت باقی نہ رہے گی اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ حق کی پیروی سے بالآخر فتح اور حق کی خلاف ورزی سے بالآخر شکست متحقق ہوتی ہے اسی کو فن تاریخ کی اصطلاح میں کائناتی قانون عروج و زوال کہتے ہیں۔ جس کا اعلان قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

پیغام حق کا پہنچنا یہ ہے کہ کیا حق کی خلاف ورزی

بَلِّغْهُ ۗ فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ

کر نیوالی قوم کے سوا کسی اور کو بھی تباہ کیا گیا۔ ہرگز نہیں

الْفٰسِقُوْنَ (الاحقاف: ۳۶، ۳۵)

گویا تباہی و ہلاکت صرف حق سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ قرآنی تعلیمات میں نتیجہ خیزی کی قطعی ضمانت کا یہ اسلوب خود اسکی تحانییت کی ایسی زبردست دلیل ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب آج تک اس کا بدل یا مثل پیش نہیں کر سکی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت ایک ایسی حقیقت ثابت ہے کہ دعوت اسلام پر برہم ہو کر کفار و مشرکین مکہ نے آپ کو کیا کچھ نہیں کہا وہ کون

۹۔ اُمیّت صاحبِ قرآن ﷺ

سافر تار و بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر، کاہن اور مجنوں کہا، ایذا رسانی میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالم کفر میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ آپ اُمّی نہیں ہیں اور یہ قرآن آپ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ گویا آپ پر اتہام کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفین اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور علیہ السلام نے اعلان نبوت سے قبل یا بعد کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو۔ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے ہوں۔ کسی فاضل سے علوم و معارف، عربی ادب کی فصاحت و بلاغت، شعر و سخن کے اصول اور حکمت دانائی کے خزانے حاصل کیے ہوں۔ آنحضرت ﷺ اپنے معاشرے میں اُمّی اور صادق و امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علم و معرفت سے معمور کلام کا آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونا ہی اسکے منزل من اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اسی لیے ارشادِ باری ہے:-

اور تم نے قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھی تھی

وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَفْتُونَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ

اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ ہاں

وَ لَا تَخْطُهُ بِيَمِينِكَ إِذْ أَلَا زَاتَابِ

پرست یقیناً شک میں مبتلا ہو جاتے۔

المُبْتَلُوْنَ (العنکبوت: ۲۹)

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے :-

أَلَمْ يَكْفُرْ بِمِائِنَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ

الْكِتَابَ يُثَلِّئُ عَلَيْهِمْ (العنکبوت ۲۹: ۵۱)

کیا ان لوگوں کے لیے یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم

نے تم پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے

گویا آپ پر ایسی کتاب کا نازل ہونا اور آپ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی محنت مند مدرسہ یا استاد سے پڑھے بغیر زبانہ گذشتہ و آئندہ کے احوال بیان کرے عقائد

صحیحہ کا مدلل احقاق اور عقائد باطلہ کا قوی ابطال کرے، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کرے اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا پرچار کرے طبعی اور مابعد الطبعی حقائق کا تفصیلی ذکر کرے۔ سیاست و معاشرت

اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو۔ صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی امور سے متعلق قوانین بنائے حکمت دانائی، تدبیر و بصیرت اور ضابطہ اصلاح احوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفہ

حیات کی بات کرے جو ابد الابد تک قابل عمل اور انقلاب آفریں ہو لیکن پھر بھی اس کا کلام حق تصور نہ کیا جائے۔ یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے۔ بلاشک و شبہ نبی اکرم ﷺ کی اُمیت قرآن کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل تھی۔ حضور علیہ السلام نے

اُمی ہونے کے باوجود ماکان و مایکون کے جمیع علوم خود رب ذوالجلال سے حاصل کر لیے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ

فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا - (النسارہ ۴: ۱۱۳)

اور اللہ نے آپ کو علم عطا فرمایا ہر اس چیز کا جو آپ

نہ جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے

لفظ قرآن کے چوتھے مادۃ استتقاق کے حوالے سے مذکورہ بالا نو قرآن ان داخلی دلائل میں سے چند ایک ہیں جن سے قرآن کی صداقت و حقانیت بغیر کسی خارجی شہادت کے پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے

باری تعالیٰ نے اس مقدس و معظم کتاب کا نام "القرآن" رکھا تاکہ دلائل و شہادات کے طالبوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اپنے ہر دعویٰ کی صحت و صداقت کے ثبوت میں خود اپنے اندر ہی ہزاروں داخلی

قرآن رکھتی ہے۔ اسے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے اصلاً کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں



اسلام کے علمی، روحانی اور انقلابی پہلوؤں پر مشتمل

جناب رفیر محطابہ القادمی کی چند معرکہ الآراء

تعاریف

- ۲۵ عصر حاضر اور فلسفہ اجتہاد
۲۶ حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
۲۷ پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
۲۸ قرآنی فلسفہ تبلیغ
۲۹ فطرت کا قرآنی تصور
۳۰ قرآنی فلسفہ عروج و زوال
۳۱ پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب
۳۲ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)

- ۲۳ Islam In Various Perspectives
۲۴ Quranic Concept of Human Guidance
۲۵ Islam and Freedom of Human will
۲۶ Islamic Concept of Human Nature
۲۷ Quranic Basis of Constitutional Theory
۲۸ Philosophy of Ijtihad and the Modern World
۲۹ Islamic Concept of Crime
۳۰ Islam-The State Religion
۳۱ Islamic Philosophy of Punishments
۳۲ Islamic Concept of Law
۳۳ Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
۳۴ Islamic Philosophy of Human Life
۳۵ Constitutional Structure of an Islamic State (U.P.)

۱ تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
۲ سورۃ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
۳ اسلامی فلسفہ زندگی
۴ اجزائے ایمان (حصہ اول)
۵ اجزائے ایمان (حصہ دوم)
۶ اجزائے ایمان (مکمل مجلد)
۷ ایمان اور اسلام
۸ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
۹ مناجات العرفان فی لفظ القرآن
۱۰ بلاسو و بنکاری (عبوری خاکہ)
۱۱ منافقت اور اس کی علامات
۱۲ سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۳ معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۴ اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
۱۵ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی
۱۶ تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحب ہدایہ کا مقام
۱۷ معارف اہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۱۸ شہادت توحید
۱۹ اقبال اور تصور عشق
۲۰ تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
۲۱ حکمت استاذہ (تفسیر ابو ذبائذ باللہ من شیطان الرجیم)
۲۲ فلسفہ تسمیہ (بسم اللہ الرحمن الرحیم)
۲۳ معارف اسم اللہ جل جلالہ
۲۴ صفت رحمت کا شان امتیاز

اتفاق اسلامک اکیڈمی ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور فون ۸۵۴۹۲۲ ضیاء القرآن پبلیکیشنز گنج بخش روڈ لاہور ۶۳۴۶۴
: جامعہ مسجد رحمانیہ ۲۰۵ شادمان لاہور (برموقعدرس) : بی ای پلور۔ شاہراہ قائد اعظم بالمقابل ہائی کورٹ لاہور فون ۵۲۰۹۶
: المالک فلیٹس B/6 نزد جاناگیر پارک بالمقابل ایمپرس مارکیٹ کراچی صد فون: ۴۳۸۴۸۲

